فہرست مضمون نگارانِ معارف

(جلد ۷۳)

جنوری ۱۹۵۴ء تا جون ۱۹۵۴ء

(بہ ترتیب حروفِ تہجی)

شعراء

فہرست مضامین معارف

(جلد ۷۳)

جنوری ۱۹۵۴ء تا جون ۱۹۵۴ء

(بترتیب حروف تہجی)

جلد ۷۳ ماہ جمادی الاول ۱۳۷۳ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۵۴ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

گذشتہ مہینہ ۲۶؍ اور ۲۷؍ دسمبر کو حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار مین دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ مین مولانا مسعود علی صاحب ندوی و مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کی صدارت مین ایک اہم علمی تاریخی اجتماع ہوا، جس مین سید صاحبؒ کی مختلف علمی حیثیتون اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤن پر مقالات پڑھے گئے، اور تقریرین ہوئین، یہ اجتماع ہر حیثیت سے نہایت کامیاب رہا، ہندوستان کی تقسیم کے بعد سے مسلمانون کا اتنا بڑا اجتماع لکھنؤ مین نہین ہوا تھا، ندوہ کا وسیع ہال حاضرین سے بھرا ہوا تھا، جس مین مقامی علمائے کرام، لکھنؤ یونیورسٹی کے مسلمان اساتذہ، اخبارات کے اڈیٹر اور شہر کے اعیان و اکابر کے علاوہ دہلی، بھوپال، پٹنہ، پھلواری، مسلم یونیورسٹی، اور جامعہ ملیہ کے بعض علماء و اصحاب علم نے بھی شرکت کی،

مقالات فاضلانہ اور تقریرین موثر تھین، مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی نے "سیرت نبویؐ کی ترتیب مین سید صاحب مرحوم کا مجتہدانہ کارنامہ" مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی نے "مولانا سید سلیمان ندوی بحیثیت اڈیٹر" سید صباح الدین عبد الرحمن نے "سید صاحب کے ادب و انشا پر ایک نظر" مولانا عبد السلام صاحب قدوائی ندوی نے "سید صاحب یا ندوہ کا مثالی کردار" مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی نے "سید صاحب درعلوم قرآن" مولانا عبد اللہ ندوی نے "سید صاحب اور ادب عربی" اور مولانا ابو العرفان صاحب ندوی نے "شذرات سلیمانی" کے عنوانات سے مقالات پڑھے، یہ تمام مقالات نہایت مفید تھے، خصوصاً مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی اور مولانا عبد الماجد صاحب کے مقالے علمی نکتہ آفرینیون و ادبی لطافتون سے معمور تھے،

مقررین مین مفتی عتیق الرحمن صاحب ناظم ندوۃ المصنفین دہلی، خان بہادر ظفر حسین خان ریٹائرڈ انسپکٹر مدارس، پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی، ڈاکٹر مصطفی حسن صاحب علوی، مولانا مسعود علی صاحب ندوی اور مولانا سید ابو الحسن علی نے تقریرون کے ذریعہ اپنے جذبات و تاثرات ظاہر کئے، مولانا ابو الحسن علی کی تقریرین ان کی شخصیت کی طرح نہایت موثر و دلآویز تھین، حاضرین نے بڑی توجہ اور دلچسپی سے ان مقالات اور تقریرون کو سنا، جلسہ کے دوران مین حضرت سید صاحب

رحمۃ اللہ علیہ کی دو نظمین جو انھون نے آخری بستر علالت پر کہی تھین، اور جن مین سفر آخرت کی تیاری کی بلند بشارات تھے، ان کے عزیز جناب حمید صدیقی نے اپنے دلکش انداز مین سنائین، یہ نظمین اپنے معنی اور محل کے اعتبار سے اس قدر مناسب تھین کہ پورا جلسہ بزم ماتم بن گیا، اور اکثر حاضرین کی آنکھون سے بے اختیار آنسو رواں ہو گئے، اس لحاظ سے یہ نظمین اس جلسہ کا حاصل کہی جا سکتی ہین،

اس سلسلہ مین دار العلوم کے طلبہ نے اپنی علمی انجمن الاصلاح مین "آثار سلیمانی" کے نام سے حضرت سید صاحب کی تصانیف و مضامین اور دار العلوم کے کتبخانہ کی نادر قلمی کتابون کی ایک نمائش ترتیب دی تھی، اور ہندوستان کے مسلمانون کی علمی و تعلیمی تاریخ کو نقشون کے ذریعہ دکھایا تھا، جو بہت دلچسپ چیز تھی، اور یہ نمائش اس جلسہ سے بڑی مناسبت رکھتی تھی، یہ جلسہ مختلف حیثیتون سے مدتون یادگار رہیگا، اسکی کامیابی مین صاحب یادگار کی شخصیت کے علاوہ جلسہ کے داعی مولانا ابو الحسن علی کی کشش و کوشش اور اُن کے اخلاص و حسن نیت کو بھی بڑا دخل تھا، دار العلوم کے مہتمم مولانا محمد عمران خان صاحب ندوی نے بڑی مستعدی اور خوبی سے میزبانی اور مہمانون کی راحت رسانی کا فرض انجام دیا،

دار المصنفین تو مجسم حضرت سید صاحبؒ کی یادگار اور اس کے ذرہ ذرہ پر ان کا نام ثبت ہے، تاہم انکی یادگار کے سلسلہ مین بھی بعض کام پیش نظر ہین، جن مین سب سے مقدم سیرت سلیمانی کی تالیف اور اُن کے مقالات و مکاتیب کی جمع و ترتیب ہے، مگر ابھی اس کام مین عرصہ لگے گا، اس لئے اس کا آغاز معارف کے خاص نمبر سے کیا جائیگا، کوشش یہ ہو گی کہ یہ نمبر سید صاحبؒ کی زندگی کے تمام اہم پہلوؤن پر حاوی اور اُن کے حالات کا مرقع ہو، اور اس مین سیرت سلیمانی کا اجمالی خاکہ آ جائے،

گذشتہ سنہ اس لحاظ سے بہت اندوہناک تھا کہ اس کے آخری مہینون مین دنیائے اسلام کی متعدد بڑی شخصیتون نے سفر آخرت کیا، ان مین ایک اہم شخصیت سلطان عبد العزیز آل سعود کی تھی، جو اپنے اوصاف و خصوصیات کے لحاظ سے موجودہ تمام مسلمان فرمانرواؤن مین نہایت ممتاز حیثیت رکھتے تھے، اُن کی ذات مین علم و دین، تدبر و سیاست اور شجاعت و حوصلہ مندی کا بے مثل اجتماع تھا، انھون نے اپنے تدبر و شجاعت سے اپنے اسلاف کی کھوئی ہوئی عظمت و شوکت دوبارہ حاصل کر لی، اور حجاز پر قبضہ کر کے نجد کی معمولی ریاست کو ایک طاقتور حکومت بنا دیا، انکو اپنے اسلاف کی طرح رد بدعات اور احیاء سنت مین بڑا اہتمام تھا، اور اس سلسلہ مین انھون نے مفید مذہبی اصلاحات کین، ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھون نے حجاز جیسے علاقہ کو جہان وحشی بدوؤن کے ہاتھون انسانی جان و مال کی کوئی قیمت نہ تھی، اور ترکی جیسی طاقتور حکومت اپنے زمانہ مین امن قائم نہ کر سکی تھی، امن و امان کا ایسا گہوارہ بنا دیا

جس کی نظیر اس زمانہ مین نہین مل سکتی، اور جس کا اعتراف دوست و دشمن سب کو ہے، آج حجاز کے جس ویرانہ مین چاہے انسان سونا اچھالتا ہوا چلا جائے، کوئی شخص آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہین کر سکتا، بلکہ راستہ مین گری پڑی ہوئی چیزون کو بھی کوئی شخص اٹھانے کی جرأت نہین کر سکتا،

سلطان خود صاحب علم، اور علما اور علوم و فنون کے بڑے قدردان تھے، انھون نے نجد و حجاز مین بہت سے مفید علمی و تعلیمی کام انجام دیئے، اگرچہ عام نجدیون مین طبعاً سختی و درشتی ہوتی ہے، اور وہ اپنے عقیدہ کے خلاف دوسرون کے عقائد مشکل سے برداشت کر سکتے ہین، جسکی بنا پر مسلمانون کے بعض طبقون کو ان سے تکلیف پہنچی، مگر سلطان اس بارہ مین معتدل اور رواداری تھے، اور عقائد مین، اصول کے علاوہ فروعات مین سختی نہ کرتے تھے، وہ خود حنبلی تھے، مگر اہلسنت کے باقی تینون مذاہب کی بھی پوری عظمت اور انکے علما کی عزت کرتے تھے، اور ان کے پیرؤن کے ساتھ فراخ دلی سے پیش آتے تھے اب صحرائے عرب مین ہوا کا رُخ دوسری طرف ہے اور اس کے ریگستانون مین بھی جدید تمدن کے اثرات بڑی تیزی کے ساتھ پھیل رہے ہین ان حالات مین سلطان کا وجود بہت غنیمت تھا، ان کے بعد ان کے برے اثرات کو روکنے والا کوئی نظر نہین آتا، اللہ تعالیٰ اس حامی سنت و خادم الحرمین سلطان کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے،

دوسرا حادثہ علامہ یوسف علی کی وفات کا ہے، وہ جدید تعلیم کی بہترین پیداوار، بہت پرانے اور بڑے فاضل آئی سی ایس تھے، انگریزی پر اُن کو اہل زبان جیسی قدرت حاصل تھی، وہ متعدد بلند پایہ کتابون کے مصنف تھے، اُن کی ایک کتاب کا ترجمہ "ہندوستان قرونِ وسطیٰ مین" کے نام سے اردو مین بھی شائع ہو چکا ہے، یہ اُن کے ان لیکچرون کا مجموعہ ہے جو انھون نے ہندستانی اکیڈمی الٰہ آباد مین دیئے تھے، اگرچہ اُن کا قالب مغربی تھا، مگر اُن کا قلب ہمیشہ مومن اور ان کا قلم ابتدا سے اسلام کی خدمت مین مصروف رہا، اُن کا سب سے بڑا علمی و دینی کارنامہ قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ ہے، جو ادبی خوبیون کے لحاظ سے انگریزی زبان کا شاہکار سمجھا جاتا ہے اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ مترجم نے ان جدید مفسرین کے برعکس جو محض یورپ کی مرعوبیت مین آیاتِ قرآنی مین خود ساختہ تاویلین کرتے ہین، اپنے حواشی مین کوئی ایسی تاویل نہین کی ہے جو سلف کے عقائد کے خلاف ہو اس لئے دینی طبقہ مین بھی اس ترجمہ کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا، اللہ تعالیٰ اپنی کتاب عزیز کے اس خادم کو اس کی خدمت کا صلہ عطا فرمائے،

مقالات

آہ سیّد صاحب!

ہم پر کیا گذری

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء مطابق ۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ کا دن گذار کر عشاء کی نماز کے بعد حسب معمول خبرین سننے کے لئے ریڈیو کھولا، پونے نو بجے جب پاکستان سے انگریزی خبرین شروع ہوئین تو ہم خبرون مین دوسری خبر یہ سنی کہ ہم دلی رنج و الم کے ساتھ اعلان کرتے ہین کہ

"ابھی کچھ دیر پہلے علامہ سید سلیمان ندوی کا انتقال ہو گیا"

سنتے ہی چیخ اٹھا اور کرسی سے لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑا، اہلیہ پاس ہی ایک پلنگ پر بیٹھی تھین، گھبرا کر پوچھنے لگین "کیا ہوا، کیا ہوا" مین نے چیختے ہوئے کہا: "سید.......صاحب.......کا.......انتقال ہو گیا" وہ چیختی ہوئی کمرہ سے نکل پڑین کہ ہائے چھوٹے نانا کا انتقال ہو گیا،........مین فرش سے اٹھ کر اندر گھر جانے کے بجائے زار زار روتا ہوا برادر محترم جناب شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی کے کمرہ کی طرف دوڑا، اور قریب پہنچ کر چلایا،

شاہ صاحب! سید صاحب.......سید صاحب.......!

شاہ صاحب نے پوچھا کیا ہوا.......خیریت تو ہے؟

میں نے روتے ہوئے کہا "سید صاحب کا انتقال ہوگیا"،

اتنا سننا تھا کہ اُن کے منہ سے بھی چیخ نکل گئی، اور وہ مجھ سے لپٹ گئے کہ "آہ! یہ کیا ہوگیا" میں دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا، شاہ صاحب مجھ کو چھوڑ کر سر پکڑ کر بستر پر بیٹھ گئے، ہماری آوازیں سُن کر استاذی المحترم مولانا عبدالسلام ندوی بغل کے کمرے سے یہ کہتے ہوئے نکل آئے "ہیں، کیا ہے کیا ہے"، شاہ صاحب بمشکل تمام اُن سے یہ کہہ سکے کہ

"سید صاحب جنت کو سدھارے"،

مولانا ہکا بکا ہو کر رہ گئے، پوچھا کس نے کہا اور کہاں سے خبر آئی، شاہ صاحب نے کہا کہ ابھی ریڈیو سے معلوم ہوا ہے، مولانا کہنے لگے "مجھ کو چکر آرہا ہے" اور وہیں تخت پر بیٹھ گئے، اور میں اس گدی کرسی پر جو سید صاحب نے شاہ صاحب کو دی تھی، بیٹھ گیا، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، مولانا عبدالسلام صاحب نے غایت شفقت و محبت میں مجھ سے کہا:

"صبر کیجئے صبر، اتنا نہ روئیے"

میں نے اُن سے گستاخانہ طور پر بلند آواز میں کہا "مجھے رونے دیجئے، صبر کی تلقین نہ کیجئے"،

شاہ صاحب کے کمرہ میں بمشکل دس منٹ ٹھہرا ہوں گا کہ غایت اضطراب میں وہاں سے نکل کھڑا ہوا، وہ مجھ کو آواز دیتے رہے، لیکن میں اپنے گھر کی طرف بھاگا، وہاں کہرام مچا ہوا تھا، عورتیں بچے سب رو رہے تھے، ریڈیو سے خبریں جاری تھیں، اور اب پاکستان سے اردو میں خبریں دہرائی جا رہی تھیں،

پھر ایک بار سید صاحب کی رحلت کی خبر سنی، جی چاہا ریڈیو توڑ ڈالوں کہ کیا اسی المناک خبر سننے کے لئے اس کو رکھا تھا، اور جلدی سے اس کو بند کر دیا، اب روتے روتے ہچکیاں آنے لگی تھیں، آہ یہ وہی کمرہ ہے! جہاں سید صاحب نے اپنی زندگی کے سولہ سترہ سال گذارے تھے، اب یہ ویسا آراستہ اور بارونق تو نہیں ہے! لیکن ان کی بعض یادگاریں اب تک یہاں محفوظ ہیں،

بے قرار ہو کر کمرہ میں ٹہلنے لگا، دیوار پر اُن کی یادگاروں میں سے شیشہ کے چوکھٹوں پر نظر پڑی، ایک چوکھٹہ میں خط کوفی میں لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا نظر آیا، میں دل میں کہنے لگا کہ آہ! آج اُس کی تفسیر لکھنے والا چل بسا، اور خیال آیا کہ سید صاحب نے ایک بار فرمایا تھا کہ

"لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ سیرۃ النبی کو چھ جلدوں میں لکھنے کی کیا ضرورت تھی، اصل سیرت تو پہلی دو جلدوں میں ختم ہوگئی ہے، میں جواب دیتا ہوں کہ پہلی دو جلدوں میں تو صرف یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا تھے، اور باقی چار جلدوں میں یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے کیا پیغام لائے اور کیا تعلیم دی"

گویا تمام جلدوں میں لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہی کی شرح لکھی گئی ہے، ایک دوسرے چوکھٹے پر نظر پڑی تو خط طغرا میں محمد لکھا تھا، میری زبان سے نکلا کہ محمد کا سیرت نگار اب محمد کی آغوش رحمت میں ہوگا، پھر خیال آیا کہ سید صاحب نے ایک مرتبہ اسی کمرہ میں فرمایا تھا کہ میں نے اسی کمرہ میں خواب میں دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں، اور سیرۃ النبی کے اوراق الٹ پلٹ کر دیکھ رہے ہیں، اور مسکرا رہے ہیں، یہ واقعہ یاد کر کے میرے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا کہ اللہ اکبر! یہ کمرہ کس قدر مقدس اور بابرکت ہے، اور میری نظر ادھر ادھر دوڑنے لگی کہ کہیں کوئی بے ادبی تو نہیں ہو رہی ہے،

بے قراری میں پھر ٹہلنے لگا، یکایک میری نظر ان چوکھٹوں پر بھی پڑی جن میں امجد حیدرآبادی کی رباعیاں لکھی ہوئی تھیں، ان رباعیوں کا ایک مصرع یہ بھی تھا،

ع اک چشم زدن میں کیا سے کیا ہوتا ہے،

اس کو بار بار دہرا رہا کہ آہ! سید صاحب کی رحلت سے کیا سے کیا ہوگیا، اسلامی دنیا ایک بڑی دولت سے محروم ہوگئی، ایک بڑی نعمت فرش زمین سے عرش بریں کی طرف منتقل ہوگئی، دارالمصنفین یتیم ہوگیا، گو کئی سال سے وہ ہم سے دور کراچی میں تھے لیکن انھوں نے ہم لوگوں کو اپنے قلب و جگر کا ٹکڑا ہی بنا کر رکھا تھا، اور وہ بھی ہم لوگوں کے

دل و دماغ پر چھائے رہتے تھے،

پھر اشکبار آنکھون کے ساتھ بستر پر لیٹنے کی کوشش کی لیکن ایسا معلوم ہوا کہ وہ خود مسہری پر لیٹے ہوئے ہین، مین بستر پر لیٹ نہ سکا، بیٹھا رہا، اور ایسا نظر آیا کہ وہ مسہری سے اتر کر نیچے اپنے خوش رنگ و خوش وضع قالین پر بیٹھے ہین، اور ان کا چاند کے جیسا چمکتا ہوا چہرہ نگاہ کے سامنے ہے، دار المصنفین کے رفقا اُن کے اردگرد مودب بیٹھے ہین، اور وہ حسب معمول مذہبی اور اخلاقی درس دے رہے ہین، علمی نکتے بیان کر رہے ہین، اور تصوف کے اسرار فاش کر رہے ہین، اس تصور سے بے چین ہو گیا، اور وہ ساری مجلسین نگاہون مین گھومنے لگین جو اس کمرہ مین ہوتی رہتی تھین، اور یاد آیا کہ وہ اکتوبر ۱۹۳۵ء مین جب ذات الجنب کے مرض مین مبتلا ہوئے تھے تو اسی کمرہ مین رہتے تھے، مین اسی سال نیا نیا دار المصنفین آیا تھا، تمام لوگون نے بڑی دل سوزی اور محبت سے اُن کی تیمار داری کی تھی، پھر ۱۹۴۳ء کے مارچ مین یہین قلب کے مرض مین مبتلا ہوئے تھے، جس مین دوبارہ کراچی مین مبتلا ہو کر اللہ کو پیارے ہوئے، یہان بھی ان کا قلب بڑھ گیا تھا، اور ایسی تکلیف ہوئی تھی کہ چھتیس گھنٹے مسلسل کھڑے رہ گئے تھے، بیٹھنے اور لیٹنے مین تکلیف ہوتی تھی لیکن یہان بھی ڈاکٹر عبد الحفیظ انصاری نے بڑی تندہی اور محنت سے علاج کر کے مرض پر قابو پا لیا تھا، خیال آیا کہ اگر کراچی کے بجائے اعظم گڈہ مین بیمار پڑتے تو پھر ڈاکٹر عبد الحفیظ ان کو اچھا کر لیتے لیکن مشیت ایزدی اور ہی تھی،

اب میرے آنسو تو تھم چکے تھے، لیکن دل مین رنج والم کا تلاطم بپا تھا، مومن کا یہ شعر زبان پر آ گیا،

اجزاے دل کا حال نہ پوچھ اضطراب مین
بے نالہ منہ سے جھڑتے ہین بے گریہ آنکھ سے

مین تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا، اور سکون پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن کسی طرح طبیعت قابو مین نہ آئی، غم کا پہاڑ ٹوٹا پڑتا تھا، بار بار اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا، اور یہ حال تھا کہ

ع تاثیر صبر مین نہ اثر اضطراب مین

بالآخر گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر بستر پر نیم دراز ہو گیا، میرا سر قبلہ کی طرف تھا، بائین طرف زنانخانہ کا برآمدہ تھا

جس مین سید صاحب عموماً مغرب کے بعد آ کر بیٹھا کرتے تھے، اور یہین اُن کی خانگی مجلس منعقد ہوتی تھی، یہ مجلسین نظرون کے سامنے گھومنے لگین،

ان کا معمول تھا کہ صبح ناشتہ کے بعد کتب خانہ مین میز پر بیٹھ جاتے، اور جب تک کام کرتے، دنیا و مافیہا سے بے خبر رہتے، دو قدم پیچھے دیوار سے لگی ہوئی گھڑی گھنٹے پر گھنٹہ بجاتی رہتی لیکن اُن کو مطلق خبر نہ ہوتی کہ کتنے گھنٹے گذر گئے، دوپہر کے کھانے پر ہم لوگ آ کر بیٹھ جاتے لیکن ان کا اشہب قلم دوڑتا ہی رہتا، آدمی پر آدمی بلانے کے لئے جاتا لیکن وہ قلم نہ چھوڑتے، اور سب کے آخر مین با دل ناخواستہ اٹھ کر آتے، کھانے مین شریک ہوتے، پھر گھر چلے جاتے، اور اپنے اسی کمرہ مین آ کر قیلولہ فرماتے، جس مین یہ سیہ بخت اس وقت لیٹا ہوا تھا، تھوڑی سی جھپکی لینے کے بعد اٹھتے، وضو کرتے، مسجد مین ظہر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتے، پھر کتب خانہ مین آ کر بیٹھ جاتے، اور عصر تک اسی انہماک سے کام مین مشغول رہتے، عصر کی نماز کے بعد چائے پر دار المصنفین کے تمام رفقا اُن کے پاس جمع ہو جاتے، اُن کے انشراح کا یہی وقت ہوتا تھا، بڑی محبت و شفقت سے باتین کرتے، زیادہ تر مذہبی، علمی اور سیاسی مسائل پر گفتگو ہوتی، اُن کی مذہبی اور علمی گفتگو ہم لوگ ہمہ تن گوش ہو کر سنتے، اور ایسا معلوم ہوتا کہ ہم سب پر الہام ہو رہا ہے، وہ چند فقرون مین علمی حقائق اس طرح بتا دیتے کہ علوم کا دفتر نگاہ کے سامنے کھل جاتا، خود مجھکو ذاتی تجربہ ہے کہ جب کوئی علمی یا تاریخی گتھی ان کے سامنے پیش کی تو وہ چار فقرون مین پوری گتھی سلجھا دیتے، کسی مضمون کا خاکہ یا کسی کتاب کی ترتیب اُن کی مختصر سی ہدایتون پر مکمل طور سے ذہن مین آ جایا کرتی تھی، ہان سیاسی موضوع پر البتہ ان سے بے تکلفانہ گفتگو ہوتی تھی، اس مین اظہار خیال کی پوری آزادی تھی، اور اپنی رائے کے مخالف خیال کو بھی پوری توجہ اور مسرت سے سنتے تھے، مغرب کے قریب یہ مجلس ختم ہو جاتی، اور سید صاحب اپنی سب سے چھوٹی اولاد کو گود مین لے کر دار المصنفین کی اندرونی گول سڑک پر ایک دو چکر لگاتے، یہی اُن کی گویا روزانہ کی جسمانی ورزش تھی، مغرب کی نماز اور نفلین پڑھ کر زنانخانہ مین چلے جاتے، اور اس وقت اُن کی خانگی مجلس ہوتی، یہی روزانہ کی مجلسین میرے بستر پر آنکھون کے سامنے تھین،

گھر مین ایک کھری چارپائی پر آکر لیٹ جاتے، اُن کے چھوٹے صاحبزادے سلمان سلمہ جب تک محض بچہ رہے، اُن کے پہلو مین آکر سینے سے چمٹ جاتے، کبھی پیٹ پر بھی لیٹ رہتے، اُن کی دو چھوٹی بہنین بھی پہنچ جاتین، سلمان کو جن کا گھریلو نام ٹونون میان تھا، اس کا احساس تھا کہ وہ والد کے بہت چہیتے ہین، اس لئے چھوٹی بہنون پر جابرانہ حکومت قائم رکھنا چاہتے تھے، جب چھوٹی بہنین سید صاحب سے اُن کی زیادتیون کی فریاد کرتین تو میٹھے اور دھیمے لہجہ مین فرماتے :-

"ٹونو میان آپ طاغوتی حرکت کرتے ہین"۔

اور یہ کہکر مسکرا دیتے، اور اگر بچیان کبھی حدود سے آگے بڑھ جاتین، تو کہتے :-

"آپ لوگ شرارت کرین گی تو آپ کے ابا باہر چلے جائین گے، پھر آپ اپنے ابا کے پاس کیسے بیٹھین گی"

اپنے بچون کو بھی "آپ" ہی کہکر مخاطب کرتے، اور ان کو ڈانٹنے اور جھڑکنے مین بھی اُن کی فطری متانت، سنجیدگی اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹتا، اور ان کو بہلانے یا پھسلانے مین بھی کوئی ایسی بات کہتے جس مین غلط بیانی ہوتی، جب کبھی ان کو کوئی کہانی سناتے، تو وہ بھی سچی اور سبق آموز ہوتی، اس مجلس مین اُن کی دونون بڑی لڑکیان اور بیگم صاحبہ بھی اگر شریک ہو جاتین، مجھکو بھی اکثر و بیشتر اس مین شرکت کی سعادت حاصل ہوتی، اس وقت زیادہ تر تفریحی گفتگو ہوتی، بڑی لڑکیان کبھی کبھی خانگی یا دارالمصنفین کی اجتماعی زندگی کے کسی ناخوشگوار واقعہ کی طرف اشارہ کرتین تو سید صاحب برہمی ظاہر کرتے، اور فرماتے یہ میری تفریح کا وقت ہے، اس کو آپ لوگ مکدر نہ کرین، اگر کسی دن کوئی ناخوشگوار واقعہ بیان کیا جاتا تو فرماتے :-

"آپ لوگ اپنی شکایت بیان کرنا یا غیبت کرنا چاہتی ہین، اگر شکایت ہے تو مجھ سے کہنا فضول ہے، مین کیا چیز ہون، پھر غیبت مین کیون مبتلا ہوتی ہین، میرا طریقہ تو یہ ہے کہ دکھ پہنچانے والے کے لئے بھی اچھے ہی الفاظ استعمال کرتا ہون، بلکہ اس کے لئے دعاے خیر کرتا ہون"،

ایک بار اسی خانگی مجلس مین ہم سب سے مخاطب ہو کر فرمایا :-

"آپ لوگ کسی کے حلقہ ارادت مین تو داخل نہین ہین، لیکن مظلومیت کے موقع پر خوش رہین تو تصوف کی بہت سی منزلین آسانی سے طے ہو جائین"،

۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۹ء تک برابر مجھکو اُن کی خانگی مجلسون مین شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوتی رہی، اور ان ہی مجلسون مین ان کی اصلی عظمت کا سکہ میرے دل پر بیٹھا، ان مین محبت، شفقت، لینت، نرمی، حلم و بردباری، تہذیب و شائستگی، عجز و انکسار، اور عفو و درگذر کے ایسے ایسے جلوے دیکھنے مین آئے کہ مین جتنا زیادہ اُن سے قریب ہوتا گیا، اُن کا والہ و شیفتہ ہوتا گیا، اور ان کے اوصاف کو دیکھ دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے محبت و عقیدت بڑھتی گئی کہ رسول کے ایک سیرت نگار مین جب اتنے اوصاف ہین، تو پھر خود رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات بابرکات مین کیا کیا اخلاق و فضائل نہ ہون گے،

یہ تمام باتین بستر پر یاد آرہی تھین، اور یہ ساری مجلسین متحرک تصویرون کی طرح نظرون کے سامنے گھوم رہی تھین،

مین سوچنے لگا کہ وہ دارالمصنفین مین تینتیس سال رہے، وہ یہان کے آفتاب تھے، لیکن اپنے کو ذرہ ہی بنا کر رکھا، وہ یہان کے حاکم اعلیٰ تھے لیکن خادم ادنیٰ بن کر اس کی خدمت کرتے رہے، ان ہی کے فیض سے ہم مین سے ہر شخص بن گیا تھا، لیکن انھون نے اپنے کو مٹا مٹا کر رکھنا ہی پسند کیا،

ان ہی خیالات مین گم رات بھر کروٹین بدلتا رہا کہ یکایک شہر کی کسی مسجد سے فجر کی اذان سنائی دی، مین ایک لمحہ کے لئے بھی نہ سو سکا تھا، لیکن مطلق کوئی تکان نہ تھی، رات بھر گویا ہجر کی کلفت کے بجائے وصل کی لذت ہی مین گذری، اذان کی آواز سنتے ہی اُٹھ گیا، اور سوچا کہ آج مصلی بچھا کر اسی جگہ فجر کی نماز ادا کرونگا جہان سید صاحب تہجد کی نماز پڑھا کرتے تھے، یہ جگہ اس وقت بڑی منور نظر آئی، چنانچہ وہین پر نماز پڑھنے لگا، اور فرض کے بعد جب دعا کے لئے ہاتھ اٹھے تو بے اختیار زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے،

"اے رسول کے سیرت نگار! اب تو بارگاہِ رسالت مین پہونچ چکا ہے، فرشتون نے تیرا شاندار خیر مقدم کیا ہوگا، حورون نے جنت الفردوس کے پھول برسائے ہون گے، جنتِ نعیم مین امام ابن تیمیہ تیرے لئے چشم براہ ہون گے، امام غزالی تجھ کو اپنے پہلو مین جگہ دینے کے لئے بے قرار ہون گے، شاہ ولی اللہ مسرور ہون گے کہ اُن کا ہم مشرب و ہم مذاق آگیا، مولانا شبلی نے بڑھکر گلے سے لگالیا ہوگا کہ تونے میرا نا تمام کام بڑی خوبی سے انجام دیا، اور میرا نام بلند اور روشن کیا، مولانا اشرف علی تھانوی سینے سے لگاکر فرما رہے ہون گے کہ مین نے تیرے دل مین جو آگ روشن کی تھی، اس کو تونے فروزان رکھا،

آخر مین زبان پر تھا "اے رب العالمین! رحمۃ للعالمین ؐ کے سیرت نگار، دینِ متین کے خادم اور تیرے کلام کے شارح کو میری دعاؤن کی احتیاج نہین، تونے اپنی ستاری و غفاری سے خود ہی نوازا ہوگا، مصلّے سے اٹھ کر کمرہ کا بیرونی دروازہ کھولا تو ایسا معلوم ہوا کہ دار المصنفین پر اندوہ و الم کے بادل چھائے ہوئے ہین، ساری فضا مغموم ہے، یہان کے شجر و حجر تک سوگوار ہین، میری زبان سے بے اختیار نکلا کہ "موت العالِم و اللہ موت العالَم"، کمرہ سے نکل کر برآمدہ مین کھڑا ہوگیا، یہ وہی بیرونی برآمدہ تھا، جہان سید صاحب لوگون سے ملا کرتے تھے، خیال آیا کہ اسی جگہ مولانا شوکت علی مرحوم اُن سے بڑی محبت اور گرم جوشی سے ملتے تھے، یہین مولانا ظفر علی خان نے اُن سے سیاست پر باتین کی تھین، یہین رفیع احمد قدوائی موجودہ وزیر غذا نے وقت کی سیاسیات پر تبادلۂ خیال کیا تھا، یہین چودھری خلیق الزمان (فی الحال گورنر مشرقی بنگال) نے اپنا سیاسی دردِ دل بیان کیا تھا، یہین مولانا حسرت موہانی نے آکر اپنے نئے انقلابی سیاسی رجحانات کا اظہار کیا تھا، یہین وہ وفد آکر ملا تھا، جو مسلم لیگ کی تحریک پاکستان کے زمانہ مین مسلم اکثریت کے صوبہ سے مسلم اقلیت کے صوبہ مین آیا تھا، اس کے صدر پشاور کے ایک مشہور بیرسٹر تھے، جن کے نام کا آخری جزو غزنوی تھا، اس کے ارکین مین قاضی محمد عیسیٰ اور مولانا اکرم علی صاحب تھے، یہین ایک بار مشہور احراری لیڈر اظہر علی مظہر خاموشی سے آکر بیٹھ گئے تھے ہم مین سے کسی نے ان کو نہین پہچانا، جب انھون نے اپنا نام بتایا تو سید صاحب اُٹھ کر اُن سے بڑے اخلاق

محبت سے ملے، اس برآمدہ مین معلوم نہین کتنے اہلِ قلم آئے، اور جو آیا وہ سید صاحب کی علمی عظمت اور اخلاقی جلالت کا نقش دل پر لے کر اٹھا،

برآمدہ سے نیچے اترا تو خیال آیا کہ مولانا محمد علی مرحوم، مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو، سروجنی نائڈو، اور پنڈت جواہر لال نہرو، جیسے بڑے بڑے لیڈر ان ہی کی بدولت دار المصنفین آئے، میرے قیام کے زمانہ مین پنڈت جواہر لال نہرو دوبارہ آئے، مین نے اپنی آنکھون سے دیکھا کہ وہ سید صاحب کے سامنے اس طرح بیٹھتے تھے جیسے کوئی پیارا اور مہذب بچہ کسی شفیق بزرگ کے پاس بیٹھا ہو،

پھر خیال آیا کہ یہین سید صاحب کی دعوت پر ایک بار ایک مجلسِ صوفیہ بھی منعقد ہوئی تھی، جس مین مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اکابر خلفا، خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب، مولانا وصی اللہ صاحب فتح پوری، مولانا عبد الغنی صاحب پھولپوری، مولانا محمد احسن کاکوروی، ڈاکٹر عبد الحئی صاحب اور مولانا ابرار الحق صاحب ہردوئی نے شرکت فرمائی تھی، اور خود بھی جامِ شریعت اور بادۂ طریقت سے سرشار ہوئے تھے، اور دوسرون کو بھی مخمور کیا تھا، یہ مجلسین تین دن تک رہی تھین، آہ وہ کیسے پر کیف دن تھے،

مین ان ہی باتون کو سوچتا ہوا جا رہا تھا کہ دار المصنفین کے کتب خانہ پر نظر پڑی، جہان سید صاحب کی نگرانی مین ہم لوگ کام کیا کرتے تھے، اس کو دیکھ کر دل یہ کہہ رہا تھا،

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط　　دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم مین　　نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

شاہ صاحب کے برآمدہ کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہ مغموم اور محزون بیٹھے ہین، مجھ کو دیکھ کر کہنے لگے کہ آج مسجد دیر کرکے پہنچا، جماعت کھڑی ہو چکی تھی، سلام کے بعد مولوی مسعود علی صاحب کو یہ اندوہناک خبر سنائی، وہ سُن کر متحیر ہوگئے، اور ابھی کچھ دیر پہلے تک اسی برآمدہ مین بیٹھے رو رہے اور کہہ رہے تھے کہ مین ان کے ساتھ پچاس برس رہا، ایسا شریف اور حلیم انسان کسی اور کو نہین پایا، شاہ صاحب نے پھر کہا کہ مین رات بھر

گویا جاگتا ہی رہا، ایک بجے کے بعد ذرا سی آنکھ لگی تھی تو خواب مین دیکھا کہ ہم تم اور سید حسین (سید صاحب کے منجھلے داماد ڈپٹی کمشنر آگرہ) ہندوستان کی سرحد تک پہنچ گئے ہین، سرحد کے اُس پار قریب ہی سید صاحب کا جنازہ رکھا ہوا ہے، لیکن ہم لوگون کے پاس پاسپورٹ نہین ہے، اس لئے سرحد پار نہین کر سکتے البتہ سید حسین کسی طرح سرحد پار کرکے چلے گئے، تھوڑی دیر کے بعد دیکھا کہ دریا کے راستہ سے ایک کشتی پر جنازہ جا رہا ہے، اوپر سفید گاڑھے کا شامیانہ ہے، اور صاف شفاف لباس مین چند منور صورتین جنازہ کے ساتھ ہین، اس طرح جنازہ کی روحانی زیارت ہم دونون کو بھی ہوگئی،

تھوڑی دیر کے لئے مین برآمدہ سے ہٹ گیا، اور واپس آیا تو دیکھا کہ مولانا مسعود علی صاحب پھر آکر بیٹھے ہین، اُن کی آنکھون سے آنسو جاری ہین، مولوی عبدالسلام صاحب اور شاہ صاحب پر بھی حزن و ملال طاری ہے، اور برآمدہ ماتم کدہ بنا ہوا ہے، مجھ سے وہان کھڑا نہ رہ گیا، پھر گھر چلا آیا، جب ناشتہ کے لئے تخت پر بیٹھا تو یہ خیال کرکے کہ اسی تخت پر سید صاحب ناشتہ کیا کرتے تھے، مجھ سے اس پر بیٹھا نہ گیا، کسی طرح دو چار نوالے حلق سے اتار کر پھر باہر نکل گیا، کتب خانہ کے پاس پہنچا، تو دفتر کے چپراسی خالق رضا خان مجھ کو دیکھکر رونے لگے، وہ پہلے کتب خانہ مین کام کرتے تھے، اب دفتر مین ہین، رو رو کر کہنے لگے "صاحب! سید صاحب مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے" وہین دفتر کے قاضی احمد حسین صاحب بھی آگئے، اُن کی آنکھیں بھی اشکبار تھین، اور کہہ رہے تھے کہ ایک بہت بڑے بزرگ سے دنیا خالی ہوگئی،

مین پھر جاکر شاہ صاحب کے برآمدہ مین بیٹھ گیا، اتنے مین کتب خانہ کے ملازمین آگئے، شاہ صاحب نے کہا آج کتب خانہ بند رہے گا، یہ ربیع الاول کا مہینہ اور دوشنبہ کا دن تھا، شاہ صاحب اور ہم یہ کہہ رہے تھے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور وفات بھی اسی دن ہوئی تھی، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سیرت نگار کو بھی یہی مہینہ اور دن نصیب ہوا، صرف تاریخ مین تین دن کا فرق رہا، یہ بھی اتفاق ہے کہ استاذ اور شاگرد کی وفات مین بھی کل چار دن فرق رہا، مولانا شبلی کی وفات ۱۸ نومبر کو ہوئی تھی،

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ کتب خانہ کے لائبریرین اور پروف ریڈر ملا عبدالباری شبلی منزل مین داخل ہوئے، ملا جی سید صاحب کے ساتھ پچیس چھبیس سال تک رہے، اُن کے مسودون کی کچی کتابت وہی کرتے، اور اُن کی کتابون کا پروف بھی یہی پڑھتے رہے، سید صاحب کو اُن کی پروف ریڈنگ پر بڑا بھروسہ رہتا، اور وہ ان کو بہت مانتے تھے، ملا جی شبلی منزل مین داخل ہوکر پھاٹک سے سیدھے اپنے کمرہ کی طرف جا رہے تھے کہ شاہ صاحب نے ان کو بلاکر سید صاحب کی رحلت کی خبر سنائی، ایسا معلوم ہوا کہ اُن پر بجلی گر پڑی ہو، اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، اور دیر تک روتے رہے،

دن چڑھے شہر مین خبر پھیل گئی، اس لئے تعزیت مین آنے والون کا سلسلہ شروع ہوگیا، ان مین ایک صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ پاکستان ریڈیو سے اعلان ہوا ہے کہ ۹½ بجے صبح جنازہ کی نماز ہوگی، میرا ریڈیو دن میں کام نہین دیتا، کیونکہ پاکستان کے کسی اسٹیشن سے دن کو آواز نہین آتی ہے، ۹½ بجے کا وقت ہوچکا تھا، اس لئے خیال پاکستان ہی کی طرف تھا کہ معلوم نہین عاشق رسول کا جنازہ کس طرح اٹھ رہا ہوگا، اور دل کہہ رہا تھا کہ

ع عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

جب آنے جانے والون سے شاہ صاحب کا برآمدہ کچھ دیر کے لئے خالی ہوگیا تو وہ غایتِ اضطراب مین ٹہل ٹہل کر کہنے لگے کہ آج عالم اسلام کے ماتم کا دن ہے، اسلامی دنیا ایک بڑی جلیل القدر ہستی سے خالی ہوگئی، وہ اپنی جامعیت اور دینی حکمت و بصیرت میں شاہ ولی اللہ دہلوی کی یادگار تھے، پھر میرے شانے پر ہاتھ رکھکر کہنے لگے کہ اب ہم لوگون کو حقِ شاگردی ادا کرنا، اُن کے کامون کو تکمیل تک پہنچانا، اور اُن کے نام اور کام دونون کو زندہ رکھنا ہے، اگرچہ ان کا نام خود ہی اتنا روشن ہے کہ اس کو ہماری احتیاج نہین، لیکن دار المصنفین مین انھون نے جو شمع جلائی ہے، اس کو انشاء اللہ روشن رکھنا ہے، دار المصنفین کے ذرہ ذرہ پر ان کا نام ہمیشہ ثبت رہے گا، شاہ صاحب کے ان مخلصانہ جذبات کو سُن کر میری آنکھون سے آنسو جاری ہوگئے،

اس درمیان میں پریس اور دفتر کا وقت آگیا تھا، مولانا مسعود علی صاحب ندوی نے دونوں بند کرا دیئے اور شاہ صاحب کے برآمدہ میں آکر دفتر اور پریس کے لوگ بھی جمع ہوگئے، اُن میں ہر ایک شخص غمگین و ملول تھا،

مجھے بار بار یہی خیال آرہا تھا کہ اب جنازہ کی نماز ہو رہی ہوگی، لوگوں کا ہجوم ہوگا، ہم لوگ ایک بڑی سعادت سے محروم ہیں، اگر یہ سانحہ دار المصنفین میں ہوا ہوتا تو زندگی میں اُن کی خدمت گذاری کے ساتھ سفر آخرت پر رخصت کرنے کی آخری سعادتیں بھی حاصل ہوتیں، اور دار المصنفین میں استاد کے پہلو میں احمدِ مختار کا سیرت نگار سپرد خاک ہوتا تو دار المصنفین کی یہ دولت ہمیشہ اُس کے پاس رہتی، خود سید صاحب کو استاد کے پہلو میں دفن ہونے کی بڑی دیرینہ تمنا تھی، اور وہ اپنی جگہ بھی بہت پہلے سے متعین کر چکے تھے، ۱۹۴۲ء کے مارچ و اپریل میں سخت بیمار پڑے تھے، اُن کے منجھلے داماد سید حسین صاحب نے جو جونپور میں ڈپٹی کلکٹر تھے، اُن کو اپنے یہاں لیجانا چاہا، سید صاحب کو جانے میں کچھ تامل ہوا، اور فرمایا کہ کہیں جونپور میں وقت آخر ہو گیا، تو اپنی اصل جگہ سے محروم ہو جاؤں گا، وعدہ کرو کہ یہیں لا کر سلا دو گے تو پھر چلوں گا،

ظہر کے وقت مسجد جانے لگا تو مولانا شبلیؒ کے مزار کے پاس وہ جگہ نظر آئی، دل میں ایک درد سا اٹھا کہ یہ سعادت اس زمین کے مقدر میں نہ تھی، مسجد میں داخل ہوا تو ایسا معلوم ہوا کہ خود سید صاحب مسجد میں داخل ہو رہے ہیں، جاڑے میں کوٹ سوئٹر پہنتے تھے، اور دایاں ہاتھ اُس کی جیب میں رکھے ہوئے مسجد کے دروازے میں داخل ہوتے تھے، ہلکے پھلکے جے پوری سلیم شاہی جوتے اتار کر مسجد کے فرش پر پہلے داہنا پاؤں رکھتے، پھر اُن کی نماز کی شکل نگاہوں کے سامنے پھرنے لگی،

تحریمہ باندھنے کے بعد اُن کی گردن داہنی جانب تھوڑی سی جھک جاتی، اور ایسا معلوم ہوتا کہ بہت ہی ادب سے اللہ تبارک و تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہیں،

فجر کی نماز سے مغرب تک شہر کے عمائد و معززین کا سلسلہ جاری تھا، اور جو بھی آیا، سید صاحب ہی کا ذکر جمیل کرتا رہا،

مغرب کے بعد ہم لوگوں کے رفیق کار حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی آئے، اور وہ شہر ہی میں رہتے ہیں، اس دن صبح کو اُن کی بچی کا انتقال ہو گیا تھا، مجھ کو بڑا دکھ تھا کہ آج اُن کو دو حادثوں کا غم اٹھانا پڑا، انھوں نے اپنی بچی کی موت کی خبر عمداً ہم لوگوں کو نہ دی تھی، آنے کے ساتھ ہی کہنے لگے، آج سید صاحب کی رحلت کی خبر پا کر اپنی بچی کو بھول گیا، آج تو پورے عالم اسلام میں ماتم ہوگا، پھر بولے معلوم نہیں کراچی میں جنازہ کی نماز کس نے پڑھائی، مولانا شبیر احمدؒ ہی کے پہلو میں دفن ہوئے ہوں گے، انشاء اللہ کل ہم لوگ بھی ان کے جنازہ کی غائبانہ نماز یہاں پڑھینگے،

چھ بجے شام کو میں نے ریڈیو کھولا، اس وقت مختصر خبریں آتی ہیں، تاہم یہ معلوم ہوا کہ جنازہ بڑی شان سے نکلا، تفصیل سننے کے لئے پونے نو بجے کا انتظار کرنے لگا، شاہ صاحب بھی تفصیل سننا چاہتے تھے، اس لئے عشاء کی نماز کے بعد اپنی قیامگاہ کے سامنے والے بنگلہ میں بیٹھ گئے، اس میں بھی ریڈیو ہے، میں اپنے زنانخانہ میں چلا آیا، سوا آٹھ بجے ریڈیو کھولا تو سُنا کہ علامہ سید سلیمان صاحب ندوی پر ایک فیچر پروگرام ہے، اس فیچر کو کئی آدمی مل کر پیش کر رہے تھے، ان میں ہر ایک کا لہجہ غمناک تھا، اس میں سید صاحب کی زندگی کے ہر پہلو پر مختصر لیکن بڑا جامع تبصرہ تھا، میں ہمہ تن گوش ہو کر سُن رہا تھا، اور جب اس میں یہ کہا گیا کہ سید صاحب نے اعظم گڈھ کے ایک اُجڑے ہوئے باغ کو ملک کا سب سے بڑا شاندار، باوقار اور مستند تصنیفی ادارہ بنا دیا تو مجھ کو ایک پندار سا محسوس ہوا، یہ فیچر آدھے گھنٹہ تک پاکستان کے ہر اسٹیشن سے جاری رہا، گویا سارا پاکستان اس وقت ماتم کر رہا تھا، اس کے بعد پونے نو بجے خبریں شروع ہوئیں، اور میں انتہائی رنج و ملال کی حالت میں وہ تمام تفصیلات سن رہا تھا کہ کس طرح غیر ملکی سفراء، پاکستان کے وزراء، اعلیٰ حکام، اور ہزاروں شہریوں نے مل کر علم و فن کے نیر اعظم، اور نظر و فکر کے بدر کامل کو تہ خاک کر دیا،

پھر باری باری پاکستان کے تمام ارباب حکومت اور ممتاز افراد کے تعزیتی بیانات سُنائے جا رہے تھے، اُن کو سن کر دل میں ایک ہوک سی اٹھی کہ آہ اب ہند و پاکستان میں ایسی جامع شخصیت کہاں سے پیدا ہوگی جو مفسر بھی، محدث بھی، فقیہ بھی، متکلم بھی، صوفی بھی، معلم بھی، نعت نویس بھی، محقق بھی، مورخ بھی، ادیب بھی، شاعر بھی،

خطیب بھی، سیاسی مفکر بھی، اور سب سے بڑھ کر تقوی و طہارت اور عشق و محبت کا اعلیٰ نمونہ بھی ہو،

میں نے سوا نو بجے ریڈیو بند کر دیا، لیکن شہر کے ایک صاحب سے معلوم ہوا کہ اس کے بعد لاہور سے بھی ایک تعزیتی تقریر براڈ کاسٹ ہوئی، ڈھاکہ سے بھی اردو اور بنگلہ میں تقریریں نشر ہوئیں، افسوس کہ میں اُن کو سُن نہ سکا، ریڈیو سے تو نہیں لیکن اخبار سے یہ معلوم ہوا کہ جنازہ کی نماز مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ، اور سید صاحب کے خواجہ تاش ڈاکٹر عبد الحی صاحب نے پڑھائی اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے پہلو میں دفن کئے گئے،

ریڈیو بند کرکے بستر پر لیٹا تو دل کہہ رہا تھا کہ ہندوستان کی سرزمین رسولؐ کے سیرت نگار کو اپنے سینے میں رکھنے کے شرف سے محروم ہوگئی، اور پھر بستر ہی پر وہ تمام واقعات یاد آنے لگے کہ یہ نعمت کس طرح پاکستان منتقل ہوگئی، اور وہ یہ ہیں،

اگست ۱۹۴۹ء میں سید صاحب بھوپال سے بیگم صاحبہ اور سلمان سلمہ کے ساتھ حج کے لئے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے، زیارت خانہ کعبہ کے بعد مدینہ منورہ پہونچے، تو وہاں ان کا قیام طویل ہوگیا، اس اثنا میں لکھنؤ اور دہلی کے اخبارات میں یہ خبر پڑھی کہ سید صاحب حج کے بعد کراچی پہونچ گئے ہیں، وہاں حکومت ان سے اسلامی دستور تیار کرائیگی، یہ خبر ہم لوگوں کو بے بنیاد معلوم ہوئی، چنانچہ خود سید صاحب کا ایک شفقت نامہ مدینہ منورہ سے موصول ہوا تو اس کو پڑھکر حقیقت ظاہر ہوئی، بالآخر وہ دسمبر کی آخیر تاریخوں میں بمبئی پہنچ گئے، وہاں آکر علیل ہوگئے، جنوری کے وسط میں بھوپال آئے، اور بھوپال ہی میں تھے کہ ڈھاکہ کے ایک انگریزی روزنامہ نے یہ غلط خبر شائع کردی کہ مولانا سید سلیمان ندوی کی بیگم صاحبہ مشرقی پاکستان آرہی تھیں کہ کٹھیار کے پاس پولیس نے ان کو بلاوجہ گرفتار کرلیا، اس خبر سے پورے پاکستان میں ایک سنسنی پھیل گئی، پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے تار کے ذریعہ حقیقتِ حال پوچھی، پنڈت جی نے اُن کو اطمینان دلایا کہ یہ خبر بالکل بے بنیاد ہے،

پھر دو صفحے کا ایک تار سید صاحب کے نام اعظم گڈھ کے پتہ پر بھیجا جس میں اس غلط خبر کی تفصیل لکھ کر

اُن کی اور بیگم صاحبہ کی خیریت دریافت کی، ہم لوگوں نے اس تار کا جواب پنڈت جی کو دے کر اُن کے اخلاق و محبت کا شکریہ ادا کیا، اور اس کی خبر سید صاحب کو بھی دی، انھوں نے اپریل کے آخر میں بھوپال سے اپنا تعلق ختم کردیا، اور اہل و عیال کو لے کر اپنے منجھلے داماد کے یہاں کانپور آگئے، وہاں سے لکھنؤ آئے، اور پھر مئی کے شروع میں اعظم گڈھ تشریف لائے، یہاں آکر پنڈت جواہر لال نہرو کا تار اپنی آنکھوں سے دیکھا، تو بہت متاثر ہوئے، اور شکریہ میں اُن کو ایک خط لکھا، ہم لوگ بے حد مسرور تھے کہ اب پھر سید صاحب مستقل قیام کے لئے دار المصنفین آجائینگے اور وہی اگلی رونق اور چہل پہل قائم ہوجائے گی، یہاں وہ تقریباً دو ہفتے رہے، بڑی پرکیف صحبتیں رہیں، شہر کے تمام معززین اور عمائد آ آ کر اُن کے ارد گرد بیٹھے رہتے تھے، لیکن کانپور واپس جانے سے دو چار روز پہلے افسردہ رہنے لگے، اور اس کے کچھ اسباب بیان کرکے فرمایا میں نے یہ طے کیا ہے کہ وطن ہی میں قیام کرکے آخرت کی تیاری کروں گا، وہیں مجھکو سکون ملے گا، میں نے عرض کیا، "اور ہم لوگ" تو فرمایا:-

"آپ لوگ، کب تک کسی کے سہارے چلیں گے، کبھی کبھی دیکھ بھال کے لئے دار المصنفین چلا آیا کرونگا"

اس کے بعد یہ بھی فرمایا، "کہ تم یہاں کے گھر کا سامان رفتہ رفتہ فروخت کردو، دیسنہ میں سادہ زندگی رہے گی، سلمان کی والدہ کانپور سے پہلے اعظم گڈھ آئیں گی، یہاں سے دیسنہ چلی جائیں گی، میں اُن کو ساتھ لے کر تمھارے یہاں اسی مہینہ کے آخر تک پہنچ جاؤں گا،" یاد آتا ہے کہ وہ ۱۴ مئی ۱۹۵۰ء کو یہاں سے کانپور تشریف لے گئے، آہ! کیا معلوم تھا کہ اس تاریخ کو دار المصنفین سے دائمی مفارقت کررہے ہیں، میں اُن کو پہنچانے اسٹیشن بھی نہیں گیا، خیال تھا کہ وہ جلد ہی واپس ہوں گے، صبح و شام ان کا انتظار رہی تھا کہ ایک روز شام کو ایک تار ملا، لیکن یہ خود سید صاحب کے نام تھا، کھولا تو لکھا تھا کہ خیرسگالی وفد پاکستان جارہا ہے، آپ کا پرمٹ لے لیا گیا ہے، جلد آئیں، نیچے نام حفظ الرحمن پڑھا، مجھکو تعجب ہوا کہ یہ تار اُن کے نام کیسے آیا، دوسرے دن میں نے اُن کے پاس اصل تار بھیجنے کے بجائے ایک دوسرا تار لکھا کہ مولانا حفظ الرحمن دہلی سے تار دیتے ہیں کہ خیرسگالی وفد پاکستان جارہا ہے، آپ کا پرمٹ لے لیا گیا ہے، جلد آئیں، یہ تار پاکر سید صاحب نے مجھکو لکھا کہ خیرسگالی وفد کی اطلاع پہلے سے نہیں دی گئی لیکن اس تار

کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہان جاؤن، ذرا شمیمہ[1] اوران کے بچّون کو دیکھ لون گا، حج کے بعد سب سے تو ملاقات ہوگئی، ان سے
نہین ہوئی ہی، کانپور سے دہلی پہونچ کر مجھکو ایک خط لکھا جس مین کچھ برہمی بھی کہ

"تم نے مجھ کو یہان بھیج کر پریشانی مین ڈال دیا، مولانا حفظ الرحمٰن ناظم جمعیۃ العلماء نے مجھکو کوئی
تار نہین بھیجا، تار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے صاحبزادے عزیز الرحمٰن کی طرف سے تھا، اور
وفد تو کب کا جاچکا، ہی اب مین اپنے طور پر پرمٹ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہون"،

پھر لاہور سے اُن کا ایک خط ملا کہ یہان پہنچ گیا ہون لیکن پاس مین ایک پیسہ بھی نہین، اس لئے شیخ
مبارک علی تاجر کتب سے دوسو روپے قرض لے لئے ہین، تم دفتر مین یہ رقم شیخ مبارک علی کے حساب مین جمع
کردو، لاہور سے کراچی پہنچے تو وفد وہان سے بہت پہلے ہندوستان واپس ہونے کو روانہ ہوچکا تھا،
کراچی پہنچ کر اپنی صاحبزادی کے پاس مقیم ہوے، وہان سے خط لکھا کہ صرف چند جوڑے کپڑے ساتھ ہین
اس لئے جلد ہی واپسی ہوگی، لیکن مصلحتِ خداوندی یہی تھی کہ وہ اس سرزمین کے ہوکر رہین، اس لئے ہمیشہ
ہمیشہ کے لئے وہین کے ہوکر رہ گئے، اُن کے کراچی پہونچنے پر وہان کے ایک اخبار نے یہ لکھا کہ ان پر حکومت ہند
نے مقدمے دائر کر دیئے تھے اس لئے وہان سے پریشان ہوکر دہلی آئے، اور دہلی سے وفد کے ساتھ کراچی پہنچکر
امان لی، یہ بالکل بے بنیاد خبر تھی، اسی طرح لکھنؤ کے ایک اخبار نے اُن کے کراچی مین رہ جانے پر نا ملائم الفاظ
مین تنقید کی کہ وہ وفد کے ساتھ گئے تھے تو واپس آنا چاہئے تھا، اس کو پڑھ کر ہم لوگون کو دکھ ہوا اور
جب مین نے سید صاحب کو اس کی خبر دی تو انھون نے لکھا کہ

"تم جانتے ہو کہ مین کس طرح یہان آیا، وفد کے ساتھ میرا تعلق کہین نہین پیدا ہوا ہین
اپنے خرچ سے آیا ہون، اخبار والون کے ہاتھ مین قلم ہے جو چاہین لکھیں، تم یہ بھی جانتے ہو کہ اس
ہجرت سے مین کس قدر مالی خسارہ مین رہا"

اُن کے مالی نقصانات واقعی بہت ہوئے، دارالمصنفین کے رہائشی مکان مین اُن کا سارا سامان

[1] بڑی صاحبزادی کا نام ہے،

جون کا تون پڑا تھا، اُن کے وطن دیسنہ کے مکان مین ساری چیزین یونہی رکھی کی رکھی رہ گئین، وہان اُن کے
کئی قطعہ مکانات تھے، مردانہ نشست کا بنگلہ بڑا ہی شاندار، پرفضا اور کشادہ تھا، اس کو دیکھ دیکھ کر بہت
خوش ہوتے تھے، آمون کا ایک باغ بھی تھا جس مین ملیح آباد کے تمام اچھے آمون کے درخت تھے، جائداد
سے گھر بیٹھے ساٹھ ستر من غلہ مل جایا کرتا تھا، مختلف ڈاکخانون مین روپے بھی جمع تھے، دارالمصنفین کے علاوہ
حضور نظام کی طرف سے ماہانہ وظیفہ بھی جاری تھا، بھوپال مین پروویڈنٹ فنڈ کی رقم بھی پڑی تھی، لیکن ان
سب کو بالائے طاق رکھ کر ہجرت کا فیصلہ کر بیٹھے، اور مہاجرت کی صعوبتین بھی برداشت کرتے رہے، جون
سنہ ۱۹۵۰ء کے اوائل مین کراچی پہونچے تھے، جنوری سنہ ۵۱ء مین سلہٹ، چاٹگام اور ڈھاکہ کے ایک دورہ
کے بعد مجھ کو لکھا کہ

"یہان مذہبی و قومی کام تو کچھ نہ کچھ انجام پا رہے ہین، لیکن معاشی صورت ابھی تک پیدا
نہین ہوئی، اب یہی ارادہ ہے کہ وہی پیشۂ قدیم کتب فروشی اختیار کیا جائے"،

پھر جولائی سنہ ۱۹۵۱ء مین لکھا کہ "مہاجرت کی شان بہت بلند ہے، مہاجر صحابہؓ کی قدر اب معلوم
ہوتی ہے"، آئین بنانے کے سلسلہ مین پاکستانی حکومت نے ادارۂ تعلیمات اسلام قائم کیا تھا، اس کی صدارت ان کو
برابر پیش کی جارہی تھی، لیکن وہ اس کو قبول کرنے سے انکار کرتے رہے، چنانچہ ۸ اگست سنہ ۵۲ء کے ایک مکتوب
مین اس عہدہ کا ذکر کرتے ہوئے مجھ کو تحریر فرمایا،

"یہ تو دو برس پہلے میرے سامنے پیش کیا گیا تھا، مگر مین نے بعض شرطین رکھے تھے، وہ اب پوری
ہوئی ہین یعنی آئین کے ساتھ قانون رائج کی اصلاح کا کام اب شروع ہوا ہے، تو مین نے برضا و رغبت
کو قبول کر لیا، تاکہ پورے مسودۂ آئین پر رائے دی جاسکے، گو آئین کا کام اب ختم ہو رہا ہے"،

یہ نہ معلوم ہوسکا کہ اپنے شرائط پر یہ عہدہ قبول کیا تو کتنا الاؤنس لینا پسند فرمایا، اسی اثنا مین ان کو
لکھتا رہا کہ اگر وہ ایک بار ہندوستان تشریف لے آئین تو اپنی جائداد فروخت کر کے کم از کم پچیس ہزار روپے

حاصل کر سکتے ہیں، کیونکہ نہرو لیاقت پیکٹ سے بہار کے مہاجرین کو اپنی جائداد فروخت کرنے میں کچھ سہولت ہوگئی ہے، لیکن انھون نے جواب دیا کہ میری مردانہ نشست میں لڑکون اور زنانخانہ میں لڑکیون کا ایک ایک مدرسہ قائم کردو، اور جائداد دونون میں وقف کردو، مین نے اُن کو پھر لکھا کہ اگست ۴۷ء کے بعد اس گاؤن مین اتنی آبادی نہیں رہی کہ وہان مدرسے قائم ہوسکیں تو انھون نے جواب دیا کہ جس چیز سے منھ موڑ چکا ہون اُس کی طرف رغبت کرنے کو دل نہیں چاہتا، مارچ ۱۹۵۳ء میں کراچی سے ڈھاکہ پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس کی صدارت کے لئے تشریف لے گئے، ڈھاکہ سے ہندوستان بھی آئے، اور اپنے منجھلے داماد کے یہان فتح پور ہنسوا آکر ٹھہرے، ہم لوگون کو خبر ملی تو اعظم گڈھ سے ہم اور شاہ صاحب اُن کی قدم بوسی کے لئے فتح پور روانہ ہوئے، ہم لوگون کے ساتھ شہر کے حاجی عبدالغفور بھی ہوگئے، جو سید صاحب سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، جونپور سے مجتبیٰ جناب نیاز احمد صدیقی صاحب پرنسپل محمد حسن انٹر کالج سالار قافلہ بنے، اور جب محبت و عقیدت کا سراپا بن کر یہ چھوٹا سا قافلہ سید صاحب کی خدمت میں پہنچا، تو وہ دیکھ کر باغ باغ ہوگئے، ہم لوگ تین دن اُن کے ساتھ رہے، اور یہ تینون دن بہترین سرمایۂ حیات بن کر رہیں گے، اور جب انھون نے یہ فرمایا کہ اس سال رمضان المبارک کے بعد دارالمصنفین میں آکر ایک مہینہ قیام کرنے کا ارادہ ہے تو ہم لوگ بے حد مسرور ہوئے، یہان بھی مین نے اُن سے عرض کیا کہ اُن کی جائداد کے بعض حصے محفوظ ہیں، لیکن مکان اور جائداد کے متعلق کسی قسم کی گفتگو کرنی پسند نہیں فرمائی، زیادہ تر دارالمصنفین اور اعظم گڈھ ہی پر گفتگو کرتے رہے، رمضان المبارک کے بعد اپنی خانگی مشکلون کی بنا پر کراچی سے اعظم گڈھ نہ آسکے، مین نے اگست ۱۹۵۳ء میں ان کو پھر لکھا کہ اب جائداد پر قبضہ ہوا ہی چاہتا ہے لیکن انھون نے اس کا جواب اگست کے آخر میں یہ دیا کہ

"ہندوستان چھوٹنے پر جائداد و مکان کی محبت دل سے نکل گئی ہے، اور بقول شاعر،

بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھا لیا   اوس کی بلا سے بوم رہے یا ہما رہے

سلوک کی وہ منزل جو تصوف کی راہ سے شاید برسون میں طے ہوسکتی ہے، اس مہاجرت میں دم کے دم میں طے ہوگئی"

"دم کے دم میں طے ہوگئی"

اُن کا یہ خط آخری تھا، جو انھون نے مجھکو اپنے ہاتھ سے لکھا، اس کے بعد بیگم صاحبہ کا خط برابر آتا رہا کہ قلب کے عارضہ مین مبتلا ہوگئے ہیں، تنفس کے ساتھ بخار رہتا ہے، پھر ایک خط سے معلوم ہوا کہ ۳۵ روز تک بیٹھ لگا کر بستر پر سونا پڑا، لیکن اس خط میں یہ بھی تھا کہ رو بصحت ہیں، دفینہ کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ ۱۴ر نومبر کو انھون نے خود اپنے ہاتھ سے ایک خط لکھی جو ۱۹ر نومبر کو ملا، اس میں اپنے مرض کی تخفیف پر اطمینان کا اظہار کیا تھا، لیکن آہ! یکایک ریڈیو سے خبر ملی کہ وہ اللہ کو پیارے ہوئے، اُن کی پوری زندگی ایثار و قربانی میں گذری، دارالمصنفین مین پٹنہ کالج کی پروفیسری چھوڑ کر ایک قلیل وظیفہ پر زندگی شروع کی، اور پینتیس سال کی خدمت کے بعد بھی ۲۵۰ روپے ماہانہ ہی پر قناعت کرنا پسند فرمایا، اور پاکستان کی ہجرت کے بعد آبائی مکان و جائداد سے منھ موڑ کر اپنے ایثار و قربانی کی تکمیل کردی،

ریڈیو بند کرنے کے بعد بستر پر یہی تمام خیالات دیر تک آتے رہے، صبح اٹھا تو معلوم ہوا کہ محترمی مولانا مسعود علی صاحب ندوی نے فجر کی نماز کے بعد ہی مسجد میں قرآن خوانی شروع کرادی ہے، مین دیر کرکے وہان پہنچا، یہ قرآن خوانی زیادہ رسمی نہیں بنائی گئی تھی، صرف دارالمصنفین کے کارکنون ہی تک محدود تھی، لیکن شبلی کالج کے طلبہ کافی تعداد مین پہنچ گئے، چنانچہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد معلوم ہوا کہ کئی ختم ہوچکے ہیں، آخر میں حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی نے حاضرین کے ساتھ دیر تک دعاے مغفرت کی، پھر تمام لوگ مولانا شبلیؒ کے مزار کے قریب آکر غائبانہ جنازہ کی نماز کے لئے کھڑے ہوگئے، پہلو مین وہی جگہ نظر آرہی تھی، جو سید صاحب نے ابدی آرام گاہ کے لئے انتخاب کی تھی، جنازہ کی نماز مولوی عبدالرشید ندوی نے پڑھائی، وہ دارالعلوم ندوہ مین سید صاحب کے شاگرد رہ چکے ہیں، مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی جماعت کے سلسلہ مین کئی سال حجاز اور مصر مین قیام کر چکے ہین، چوتھی بار حج کرکے لوٹے تھے، نماز کے بعد تمام لوگ مولانا مسعود علی صاحب ندوی کے اردگرد کھڑے ہوگئے، انھون نے شاہ صاحب سے ریڈیو کی خبرین پوچھین، کراچی مین جنازہ کی تفصیلات

سُن کر اُن کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں، اور فرمایا:

"بس اب دار المصنفین کو ختم ہی سمجھئے"

رفقائے دار المصنفین اب کتب خانہ کی طرف چلے، میرے دونوں پاؤں سوسو من کے ہو رہے تھے کہ آہ! اب کتب خانہ میں کیا رکھا ہے جو وہاں جاکر بیٹھوں، کتب خانہ کے شمالی برآمدہ سے اندر داخل ہوا، تو اس بڑے ہال میں پہنچا، جہاں سید صاحب بیٹھا کرتے تھے، ان کی میز کے پاس آکر کھڑا ہو گیا، انھوں نے اپنی میز جس طرح چھوڑی تھی، اسی طرح محفوظ تھی، شاہ صاحب دار المصنفین کے شعبۂ علمی کے ناظم ہوئے تو انھوں نے ہم لوگوں کے اصرار کے باوجود اس میز پر بیٹھنا پسند نہیں کیا، سید صاحب کی میز پر اُن کا قلمدان ویسے ہی رکھا ہے، اُن کے مسودے کے کاغذات ویسے ہی پڑے ہیں، جیسے کہ چھوڑ گئے تھے، اُن کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی آکر لکھنا شروع کر دیں گے، میری آنکھوں سے پھر آنسو جاری ہو گئے کہ آہ! یہ وہی میز ہے جس پر **سیرۃ النبی** (صلی اللہ علیہ وسلم) کی چھ جلدیں ترتیب دی گئیں، جن کا جواب دنیا کی کسی زبان میں نہیں، اسی میز پر **خطباتِ مدراس** بھی مرتب کئے گئے، جو بالکل ایک نئے طرز کی سیرت ہے، اسی میز پر **رحمتِ عالم** بھی بچوں اور عورتوں کے ایمان سنوارنے کے لئے لکھی گئی، اسی میز پر **عرب و ہند کے تعلقات** بھی قلمبند کی گئی جو اپنی وسعت معلومات، تحقیق و تلاش اور حجت و استدلال کی بنا پر ہندوستان کی ایک ایسی تاریخی کتاب ہے جس کی نظیر نہیں مل سکتی، اسی میز پر **خیام** بھی سپردِ قلم کی گئی جس کی بدولت علمی دنیا کو معلوم ہوا کہ خیام ایک اعلیٰ قسم کا ریاضی دان، منجم، حکیم، صوفی اور شاعر تھا، اس کے میکدۂ سخن میں شراب کی جتنی بوتلیں ہیں وہ یا تو شرابِ عارفیت ہے یا شرابِ اخلاص یا شرابِ حقیقت یا شرابِ بے خودی ہے، اسی میز پر **عربوں کی جہازرانی** طرح طرح کے ماخذوں کے دریا میں غواصی کر کے لکھی گئی، جس سے یہ معلوم ہوا کہ موجودہ دور میں فنِ جہازرانی نے جو ترقی کی ہے اس کا ابتدائی خاکہ عربوں ہی نے قائم کیا تھا، اسی میز پر **حیاتِ شبلی** لکھ کر اپنے استاد کو خراجِ عقیدت پیش کیا، اسی میز پر تیس سال تک **معارف کے شذرات** لکھے گئے

جو ایجاز و بلاغت کے لحاظ سے واقعی سونے کے ٹکڑے ہوتے تھے، اسی میز پر معارف کے لئے مضامین لکھتے رہے جن کو اگر جمع کیا جائے تو رنگا رنگ پھولوں کے بہت سے خوشنما گلدستے بن جائیں، اسی میز پر علمی اور سیاسی کانفرنسوں کے صدارتی خطبے قلمبند کرتے رہے، جن سے علم و سیاست دونوں میں نئی نئی شاہراہیں پیدا ہوتی رہیں، اسی میز پر **وفیات** بھی لکھتے رہے جن کو پڑھ کر محترمی جناب عبد الماجد صاحب دریابادی نے ایک موقع پر تحریر فرمایا کہ سید صاحب کا وہ معاصر خوش قسمت ہے جو ان کے سامنے وفات پا جائے، اور ان کی تعزیتی تحریر کی دولت اس کے حصہ میں آئے،

اضطرابی کیفیت میں میرا ہاتھ اُن کی میز کی دراز کی طرف بڑھ گیا، اس کو کھولا تو وہ تمام خطوط نظر آئے جو اُن کے نام سے دنیا کے مختلف مقامات سے آتے رہے، اس میں مدینہ منورہ کے علماء کے بھی خطوط ہیں، قاہرہ کے فضلاء کے بھی، ترکی کے مشاہیر کے بھی، کابل کے شعراء کے بھی، فلسطین اور طرابلس کے اربابِ دانش کے بھی، جوگجاکارتا کے طلبہ کے بھی، لندن سے اڈورڈ براؤن، مارگولیتھ، نکلسن اور اربری کے بھی، پیرس سے بلوشے، موسی گنان، اور محمد خان بن عبد الوہاب قزوینی کے بھی اور نیو یارک سے مین فیلڈ کے بھی، اور پھر متحدہ ہندوستان کے ہر قابلِ ذکر شخص کے متعدد خطوط اس مجموعہ میں ملیں گے، والیان ریاست، وزراء، اعلیٰ حکام کے علاوہ سیاست، مذہب، علم، اور ادب کے سب ہی اربابِ کمال نے اپنے اپنے خطوط میں اُن سے مفید سیاسی، مذہبی، علمی، اور ادبی مشورے طلب کئے، ان خطوط کو دیکھ کر خیال آیا کہ سید صاحب نے ایک دور افتادہ شہر میں بیٹھ کر ساری دنیا کو اپنی طرف مائل کر لیا تھا، اور اُن کی ذات بابرکات کی وجہ سے دار المصنفین کس قدر بلند ہو گیا تھا، اور پھر یہ سوچ کر دل دھڑکنے لگا کہ وہ جس بلند مقام پر ہم لوگوں کو تنہا کر گئے ہیں، معلوم نہیں ہم لوگ اپنے کو وہاں برقرار بھی رکھ سکیں گے کہ نہیں،

یکایک میری نظر کتب خانہ کی تمام الماریوں پر دوڑ گئی، ان میں تقریباً دس ہزار عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کی کتابیں ہوں گی، اور ان میں شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو گی جس کو سید صاحب نے نہ پڑھی ہو، وہ کوئی کتاب

بڑھتے تو اس میں جو بھی مفید باتیں نظر آتیں، اُن کو شروع کے سادہ ورق پر نوٹ کر دیتے، جن سے رفقاء دار المصنفین کو تحقیق و تلاش میں بڑی مدد ملا کرتی ہے، وہ کتب خانہ میں کوہکن بن کر رہے، اسی لئے علوم کی جوئے شیر برابر بہا دی، پھر خیال آیا کہ اب کتب خانہ وہی ہے، اس کی ساری کتابیں بھی وہی ہیں، اور یہاں کے رفقاء بھی وہی ہیں، لیکن آہ! سید صاحب کے ساتھ امعان نظر، اعجاز بیان، زور قلم، دل پر شور اور سوز و درد بھی رخصت ہوا،

نظر اٹھی تو دیکھا کہ شاہ صاحب کتب خانہ کے مشرقی برآمدہ میں مغموم ٹہل رہے ہیں، اُن کے پاس پہنچا تو کہنے لگے آج کام میں مطلق جی نہیں لگ رہا ہے، اب کیا کام کروں پھر غمزدہ لہجہ میں بولے کہ ہم لوگ کتب خانہ میں سید صاحب کی ایک ایک یادگار کو سینے سے لگا کر رکھیں گے، ان کی زندگی میں تو اُن سے محبت کے اظہار کی جرأت نہ ہو سکی، لیکن اب اُن سے سچی محبت کے اظہار کا موقع ملا ہے، **معارف** کا ایک خاص نمبر نکالیں گے، اُن کے تمام مقالات کے مجموعے مرتب کریں گے، اُن کے مکاتیب شائع کریں گے، اور انشاء اللہ اُن کی سوانح عمری ہم سب مل کر لکھیں گے، اس روز کتب خانہ میں ہم لوگ کچھ کام نہ کر سکے، شاہ صاحب کے پاس بیٹھ کر سید صاحب ہی کا ذکر کرتے رہے،

اسی روز شہر میں تعزیتی جلسہ بھی ہوا، جس میں ہندو اور مسلمان معززین شریک ہوئے، جلسہ کی صدارت مولانا اقبال احمد صاحب سہیل نے کی جو سید صاحب کو اپنا بڑا بھائی سمجھتے تھے، کارروائی کی ابتدا جناب محمد یحیٰی صاحب اعظمی کے ایک نوحہ سے ہوئی، وہ سید صاحب کی ذات پر فخر کرتے ہوئے اُن کی زندگی میں کئی نظمیں لکھ چکے تھے، آج وہ ماتم کر رہے تھے، شبلی کالج کے ایک لڑکے نے ان کا پورا نوحہ[1] دردناک لہجہ میں پڑھا، جو رنج و الم کی کیفیت میں سنا گیا، اس کے بعد شہر کے ہندو اور مسلمان عمائد نے باری باری تقریریں کر کے اپنے غمناک جذبات کا اظہار کیا، اعظم گڈھ کے لوگ سید صاحب کو یہیں کا باشندہ سمجھتے تھے، اور خود سید صاحب کو بھی اعظم گڈھ سے بڑی محبت تھی، چنانچہ برابر معلوم ہوتا رہا کہ کراچی میں اپنے اصلی وطن دیسنہ سے زیادہ اعظم گڈھ اور ندوہ ہی

[1] یہ نوحہ معارف کی گذشتہ اشاعت (دسمبر ۱۹۵۳ء) میں شائع ہو چکا ہے،

کی یاد سے زیادہ پریشان اور بے چین رہتے،

رحلت کے تیسرے دن سے اخبارات آنے لگے تو ان کو پڑھ پڑھ کر محسوس ہوتا تھا کہ

ع: ماتم یہ زمانہ میں بپا تیرے لئے ہے،

اخبارات اڈیٹوریل لکھ رہے تھے، علماء و صلحا، اور اتقیاء اپنے اپنے المناک تاثرات کا اظہار کر رہے تھے، مضامین اور نوحے شائع ہو رہے تھے، گویا ملت کے عزادار کے لئے ساری ملت عزادار تھی، امت محمدیہ کے سوگوار کے لئے ساری امت محمدی سوگ کر رہی تھی، اسلام کے سوختہ غم کے لئے سارے پیروان اسلام وقف الم تھے، ہند و پاکستان میں جس طرح ان کا ماتم ہوا کم لوگوں کے لئے ہوا ہوگا، اور کیوں نہ ہوتا، یہ ماتم ایک عارف معارف ربانی کا ماتم تھا، گلشن رسالت کے ایک عندلیب خوش نوا کا ماتم تھا، دین مبین کے ایک غم خوار کا ماتم تھا، فضل و کمال کے نادرہ روزگار کا ماتم تھا، صدق و صفا، اور خدمت و ایثار کے پیکر کا ماتم تھا،

آہ اس تاریک خانہ کا دیا تھا اک چراغ[1] عالم اسلام میں تھا اک وہی روشن دماغ

اب ان اخباروں کے دیکھنے کے بجائے کراچی کے خط کا انتظار تھا کہ معلوم نہیں بیگم صاحبہ اور بچوں پر کیا گذری، بڑی بے چینی اور بے قراری کی حالت میں رحلت کے دسویں روز عزیزی سلمان سلمہ کا خط ملا، کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کھولا تو اس میں لکھا تھا:

"آہ! کس طرح لکھوں، کیا لکھوں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا، آپ کا تار ملا تھا، مگر بیقراری اور بڑھ گئی، اب تک اس صدمہ سے جانبر نہیں ہوا ہوں، والدہ اور بہنوں کی حالت دیکھی نہیں جاتی، بڑی غیر متوقع اور اچانک موت تھی، ہم لوگ اس کے لئے تیار نہ تھے، لیکن بس اللہ کی مرضی، انتقال کے دن بڑی مایوسانہ باتیں کیں جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اُن کو اس روز اپنے سفر آخرت کا یقین ہو گیا تھا، اماں سے پوچھا کہ ب عاصم[2] کے ساتھ مطمئن ہیں، اماں نے کہا ہاں بالکل مطمئن ہوں، ابا مرحوم نے کہا بس تو میرا قلب بھی مطمئن ہو گیا، اماں وغیرہ کو کئی دن سے ایک جگہ جانا تھا مگر ابا مرحوم کے خیال سے نہیں جا رہی تھیں، لیکن اس دن ابا مرحوم نے بڑے

[1] یہ شعر سید صاحب ہی کا ہے جو انھوں نے مولانا شبلی کی رحلت پر ان کے لئے لکھا تھا۔ [2] بڑے داماد کا نام ہے،

اصرار سے بھیجا کہ جاؤ، جب جانے لگین تو کہا دیکھئے ایک گھنٹہ میں چلی آئیگا لیکن افسوس

ع : کیا خبر تھی انقلاب آسماں ہو جائیگا

امان کے جانے کے بعد سے اُن کی وفات تک انہی کے پاس تھا، مین نے استنجا کرایا، وضو کرایا، شام کو کھیر کھلائی، پان بنا کر دیا، آخر وقت تک کی خدمت میری قسمت کیلئے تھی جسکو میں سرمایۂ آخرت سمجھتا ہون، مغرب کی نماز پڑھ کر بیٹھے، مین نے کہا گذشتہ رات کو نیند نہین آئی تھی، کچھ دیر کیلئے سو جائیے تو لیٹ گئے اور نیند آگئی، تھوڑی دیر کے بعد اُٹھے تو کچھ تشنجی کیفیت محسوس ہوئی، اور زور سے ایک گہری سانس لی اسکے بعد نہین اُٹھے ڈاکٹر وغیرہ آئے مگر کیا کرسکتے تھے وہ تو کلمہ پڑھتے ہوے اللہ میان سے مل چکے تھے، شاید رسول اکرم اپنی سیرت لکھانے سے ملنے کو بے چین تھے جو اسقدر اچانک اپنے پاس بلا لیا، آنحضرت کی دعا کیجئے اُن کے چہرہ پر سکون و اطمینان تھا، یہ پتہ مطلق نہیں چلا کہ روح کس وقت عالم بالا کو پرواز کر گئی، میرے ذہن سے انکے سکون و اطمینان کا نقشہ نہین مٹتا"

یہ خط پڑھکر ایک بار پھر میری آنکھون سے آنسو جاری ہو گئے لیکن اس خط کو جتنی بار پڑھتا سکون حاصل ہوتا جاتا، دار المصنفین کی مسجد مین عصر کی نماز کے بعد شاہ صاحب نے اس خط کی تفصیل سب کو سنائی، اس روز حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ العزیز کے خلیفہ اور سید صاحب کے خواجہ تاش مولانا عبد الغنی صاحب مد ظلہ بھی مسجد مین تشریف فرما تھے ان پر بھی سید صاحب کی رحلت کا بڑا اثر تھا، انھون نے خط کی تفصیل سنکر فرمایا کہ سید صاحب کے وصال کے بعد میرا دل اُن کو دیکھنے کیلئے بے چین تھا، چنانچہ مین ایک روز کلام پاک تلاوت کر رہا تھا کہ غنودگی آنے لگی، اور مین مصلّی ہی پر سو گیا، خواب مین دیکھا کہ جمعہ کے روز مسجد مین سید صاحب بہت ہی خوبصورت لباس پہنے ہوے بیٹھے ہین ان کی عبا بھی بہت ہی خوش رنگ ہے، بالکل جوان ہین، بڑے حسین و جمیل نظر آرہے ہین مین نے اُن سے جمعہ کی نماز پڑھانے کو کہا تو انھون نے مجھ ہی کو امامت کے لئے بڑھا دیا، آنکھ کھلنے کے بعد مولانا نے فرمایا کہ اس خواب کی تعبیر میری سمجھ مین یہ آتی ہے کہ سید صاحب جنت الفردوس مین ہین، آمین آمین!

اے متاعِ عزتِ ہمشین کے پچھلے کاروان	آہ وہ بھی مٹ گیا باقی جو تھا تیرا نشان
جس کی اک اک بات تھی روح بلالی کی اذان	جس کی رگ رگ مین بھتین سوز دروں کی چنگاریان
اب ہمیشہ کے لئے وہ آہ ہم سے چھٹ گیا	وائے ناکامی ہمارا قافلہ اب لٹ گیا

ملے یہ اشعار بھی سید صاحب ہی کے ہین جو انھون نے اپنے استاد کے نوحہ مین لکھے تھے، جو اب ہم خود ان کیلئے اپنے خونِ دل سے لکھ رہے ہین،

مسلمانون کا اندلس

(خود مسلمانون کی نگاہ مین)

از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

(۳)

مین ذکر کر رہا تھا اندلس کے مروانی حکمرانون کے رجحانات و میلانات کا یعنی عربی النسل مسلمانون پر عربیت ہی کا مذاق اندلس مین بھی غالب رہا، اسی سے اندازہ کیجئے کہ الحکم الثانی کا وہ مشہور کتب خانہ جس کی کتابون کی نہ حد تھی نہ شمار، ابن خلدون نے مستند ذریعہ سے نقل کیا ہو کہ

(۴۴) جلدون مین صرف عربی کے شعراء کے دیوانون کی فہرست ہوئی تھی[1]، ان دیوانون مین شعراء عرب کے چند محدود خیالات کی شاعرانہ تعبیرون کے سوا ظاہر ہے اور کسی دوسری چیز کی بھلا کیا توقع کی جاسکتی ہے، اسی لئے مین نے کہا تھا کہ الحکم کے علمی مذاق کو دیکھتے ہوئے غالب خیال یہی ہوتا ہے کہ عرب کے ایام جاہلیت ہی کی یادگارون سے زیادہ تر حکم کا یہ کتب خانہ معمور ہوگا، اندلس کے اس مروانی حکمران الحکم پر یہ ذوق کس حد تک غالب تھا، اس کا پتہ اس مشہور واقعہ سے بھی چلتا ہو کہ جب ابو الفرج اصفہانی اپنی مشہور اور ضخیم کتاب "الاغانی" مرتب کر رہا تھا، تو ابھی کتاب مکمل بھی نہین ہوئی تھی کہ اندلس سے الحکم کا قاصد اصفہانی کے پاس خطیر رقم کے ساتھ پہونچ گیا، اور عباسیون کے دار السلطنت بغداد سے پہلے "الاغانی" قرطبہ کے کتب خانہ مین داخل ہو گئی، یہ "الاغانی" کیا چیز ہے، ابن خلدون کے الفاظ مین اس کا جواب یہ ہو کہ

[1] دیکھئے تاریخ ابن خلدون ج ۴ صفحہ ۱۴۶، ۱۲

فیہ اخبار العرب واشعارھم، و	عرب کے ایام جاہلیت کے حالات واشعار
انسابھم وایامھم ودولھم،	اوران کے باہمی رشتے، ان کے تاریخی ایام،
(مقدمہ ص ۱۸۶)	اُن کی حکومتون کا ذکر اس کتاب مین کیا گیا ہی،

الاغانی کی ضخامت کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ تیس اونٹون پر جن معلومات کے لئے صاحب بن عباد اپنے ساتھ سفر مین کتابین لیجایا کرتے تھے، "الاغانی" کی تصنیف کے بعد تیس اونٹون کی ضرورت ختم ہوگئی، کیونکہ الاغانی مین وہ سب کچھ موجود تھا، جو تیس اونٹون پر لدی ہوئی کتابون مین تھا،

ان مروانی حکمرانون کے علمی مذاق سے اندلس کے عام مسلمان کس حد تک متاثر تھے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ قرآن وحدیث کے حفاظ تو خیر ہر اسلامی علاقہ مین اس زمانہ مین پائے جاتے تھے، لیکن آپ کو یہ سنکر حیرت ہوگی کہ "الاغانی" کے مجلدات ضخیمہ کے حفاظ بھی اندلس مین پائے جاتے تھے، المراکشی نے معجب مین "الاغانی" کے ایک حافظ کا ذکر جن لفظون مین کیا ہی، عام حالات مین مشکل ہی سے اس کو صحیح تسلیم کیا جاسکتا ہی[1] اور ایک الاغانی کیا اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہی کہ اندلس مین "سیبویہ" کی مشہور نحو کی اساسی کتاب کے حفاظ بھی تھے، دواوین عرب کے حافظون کی تو نہ حد تھی، نہ حساب، اس سلسلہ کا ایک دلچسپ لطیفہ اسی کتاب مین یہ نقل کیا ہی، کہ عربی زبان مین شعر کہنے والون کو صلہ اور انعام دینے کے لئے اندلس کے بعض امیرون نے اپنی زمین وقف کر رکھی تھی، مساجد و مدارس شفاخانے وغیرہ کے جیسے نیکی کے کامون کے متعلق اوقاف تو خیر مسلمانون کے یہان ایک عام طریقہ تھا، لیکن شعراء کے لئے وقف، یہ صرف اندلس ہی کی سرزمین کی خصوصیت معلوم ہوتی ہی، میرے سامنے تفصیل نہین ہی، بلکہ مروانی حکمرانون کی بدولت اندلس کے مسلمانون پر جو ذہنیت غالب تھی، تاریخ

[1] دیکھو معجب مین ابن عبدون کا حال بیان کیا ہی کہ کتاب الاغانی کا حفظ یہ تو اُن کی ذکاوت اور جودتِ طبع کے مقابلہ مین ذرا سی بات ہے، اس موقعہ پر ابن عبدون ہی کی طرف اس بیان کو منسوب کیا ہے کہ بچپن ہی مین مین نے الاغانی کو زبانی یاد کیا تھا، ۱۲

اندلس کی چند عام چلتی پھرتی مثالون سے اسی کو سمجھانا چاہتا ہون، خود اسی اندلس سے وطنی تعلق رکھنے والے مورخ ابن خلدون نے بھی اقرار کیا ہی کہ

واما اھل الاندلس فافادھم	رہے اندلس والے سو تعلیم مین چونکہ وہ
التفنن فی التعلیم وکثرۃ روایۃ	تنوع پسند واقع ہوئے ہین، شعر اور
الشعر والترسل ومدارسۃ	انشا پردازی، عربیت (یعنی ادب
العربیۃ من اول العمر حصول	عربی) مین ابتدائی عمر سے اپنے اوقات
ملکۃ، صاروا بھا اعرف فی	صرف کرتے ہین، اسی لئے عربی زبان کا
اللسان العربی وقصروا فی سائر	تو اُن کو کافی ملکہ پیدا ہوجاتا ہے، مگر
العلوم لبعدھم عن مدارسۃ	اُن کے سوا دوسرے علوم مین کوتاہی
القرآن والحدیث الذی ھو	رہ جاتی ہے کہ قرآن وحدیث جو سارے
اصل العلوم واساسھا،	علوم وفنون کی بنیاد ہے، ان کے درس و
(مقدمہ ص ۴۴۴)	تدریس سے وہ بے تعلق رہتے ہین،

اور عربیت کا یہ رنگ گہرا ہوتے ہوتے اندلس کے ان ہی مروانی حکمرانون مین یہان تک پہنچ گیا تھا کہ اُن کے بعض حالات وواقعات کو پڑھ کر آدمی بھونچکا ہوکر رہ جاتا ہے، اور سوچنے لگتا ہی کہ کیا اسلام کے بعد بھی جاہلیت کی باتین اندلس مین زندہ ہوگئی تھین، المراکشی نے المغرب مین الحکم کے ذکر مین لکھا ہی کہ ایک دفعہ اپنے دشمنون کے درمیان جب وہ گھرا ہوا تھا، اور اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ لوگ اس کو قتل کر دینگے، تو اپنے ایک غلام کو اُس نے شاہی عطر پیش کرنے کا حکم دیا، غلام کچھ پس وپیش کرنے لگا کہ ایسی حالت مین عطر کی بھلا کیا ضرورت ہے، تو ڈانٹتے ہوئے غلام سے کہا:

"دیکھو! جب میرا سر کاٹا جائے گا، تب شاہی عطر ہی سے لوگ پہچان سکیں گے کہ

یہ کسی عام کا نہین بلکہ بادشاہ کا سر ہے"۔ (ص ۱۶۷)

ایام اسلام کے اس الحکم کے اس قول کو پڑھ کر ایام جاہلیت کے ابوجہل (یا ابوالحکم)[1] کی وہ فرمایش یاد آجاتی ہی جو اپنے سر کاٹنے والے سے اُس نے ان الفاظ مین کی تھی،

"دیکھ! سردار کا سر ہے، ذرا نیچے سے اس کو تراشنا تا کہ مقتولون کے درمیان جب میرا سر رکھا جائے، تو عامیون کے سرون سے وہ کچھ اونچا نظر آئے"۔

اور سچ تو یہ ہو کہ دنیاوی منافع کے لئے اپنے بیٹے اور بیٹے کے بال بچون کو بھی قتل کرنے سے نہ جھجکنا جس ملک مین اس کے نمونے پیش ہو رہے ہون، وہان عربیت جس رنگ مین پہنچی تھی، اس کا اندازہ کر نا دشوار نہین ہو،

بہرحال بات بہت طویل ہو گئی، میری غرض صرف یہ ہو کہ مروانی حکومت اندلس مین جن خصوصیتون کے ساتھ قائم رہی، اور اس حکومت کے زیر اثر مسلمانون مین جن جذبات و عواطف کا نشو و نما ہوتا رہا، پڑھنے والون کو اس کا کچھ اندازہ ہو سکے، اور ان معلومات سے جو نتائج بھی پیدا ہو سکتے ہین، ان کو پیش نظر رکھ کر اب مین اس سوال کا جواب دینا چاہتا ہون کہ اندلس جیسے کوہستانی ملک اور سنگستانی خطہ مین دولت کا یہ طوفان جس کا تماشا اندلس کے مروانی حکمرانون کے زمانہ مین کیا گیا تھا، کہان سے امنڈ رہا تھا، خود اس ملک کی خراجی آمدنی ابن خلدون کے بیان سے آپ سُن چکے ہین کہ وہ اسی قدر تھی جتنی آمدنی عباسیون کو بنی گھیتی وا بیابان حجاز سے وصول ہوتی تھی، مگر یہی مورخ اس کی خبر بھی دیتا ہے کہ الزہرار کا بانی عبدالرحمن الناصر اپنی شاہ خرچیون کے باوجود خزانہ مین پندرہ ہزار مین پونڈ (دینار) چھوڑ کر مرا تھا، بلکہ المقری نے اسی قصر زہرا کے تعمیری منتظمین کے حوالہ سے اس کی تعمیر کے مصارف کا تخمینہ بتاتے ہوئے لکھا ہی،

قدر النفقة فیھا فی کل یوم	یعنی پچیس سال تک تین کرور پونڈ
بثلثمائة الف دینار مدة	(دینار) روزانہ اس قصر کی تعمیر مین

[1] زعون الامت ابوجہل کا اصلی نام ابوالحکم ہی تھا مسلمانون مین ابوجہل کے نام سے مشہور ہوا، ۱۲،

خمسة وعشرین عاماً (نفح الطیب ص۳۳۳ جلد۲) صرف ہوتے رہے،

واللہ اعلم بالصواب، یہ روایت کہان تک درست ہی، لیکن اگر کچھ بھی اس مین واقعیت ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اندلس کے خراج کی جس قدر سالانہ آمدنی تھی، یعنی ثلثمائة الف دینار، اسی قدر رقم یومیہ قصر الزہرار کی تعمیر مین پچیس سال تک صرف ہوتی رہی،

ممکن ہو کہ ان اعداد و شمار مین مبالغہ اور اغراق کے عناصر بھی شریک ہون، لیکن یہ تو تسلیم ہی کرنا پڑیگا کہ اس مبالغہ مین حقیقت کا بھی کچھ حصہ کسی نہ کسی حد تک ضرور شریک ہوتا ہے، اور اندلس کے مروانی امیرون اور دولتمندون کے جو آثار آج بھی کسی نہ کسی حد تک اس سرزمین مین موجود ہین، وہ اس کی شہادت کے لئے کافی ہین کہ ان اولوالعزمیون کی مصارف اندلس جیسے ملک کی خراجی آمدنی سے کسی طرح پورے نہیں ہو سکتے تھے، پھر آمدنی کے ان لامحدود ذرائع کا سرچشمہ آخر کیا تھا اور کہان تھا ؟

اس سوال کا تاریخ کی روشنی مین جو جواب مجھے ملا ہے، اُس نے اندلس کے متعلق میرے نقطۂ نظر ہی کو بدل دیا، یعنی اس زمانہ مین اندلس کے لفظ کو خوف و ہراس، دہشت و وحشت کے بھیانک خطرات کا جو مجسمہ مسلمانانِ عالم کے لئے بنا دیا گیا ہے، بالکل اس کے برعکس "اندلس" کا یہی لفظ مجھے تورجائیت اور امید کا مطلع نظر آتا ہے، اور اندلس کی تاریخ کے اس رُخ کو مسلمانون مین مردنی اور افسردگی پیدا کرنے کے بجائے امید و شگفتگی اور زندگی پیدا کرنا چاہیئے،

واقعہ یہ ہو کہ اندلس پہنچنے کے ساتھ ہی مسلمانون کے قدم جزیرہ نما تک محدود نہ رہے، بلکہ فاتح اندلس طارق کا آقا موسی بن نصیر، طارق کی فتح اندلس کے بعد اندلس کے راستہ سے پائیرنیز کے درون تک پہونچ چکا تھا، جس کے بعد یورپ کا سرسبز و شاداب وسیع علاقہ، جسمین فرانس اور اس کے ملحقہ تمام ممالک شامل تھے، اس لئے پائرنیز کے اس پار کے ملکون سے مسلمان ابتدا ہی مین واقف ہو چکے تھے،

آج یورپ جس حال مین بھی ہو، لیکن ان عربی مسلمانون کے گھوڑون کے پاؤن جس وقت پائرنیز

کے درون تک پہنچے ہین اس وقت یورپ کا یہ وسیع علاقہ بجز معدودے چند سلطنتون کے چھوٹی چھوٹی

ریاستون مین منقسم تھا، اور کلیسا اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے ریاستون اور امارتون کے اس انتشار، اور

اس کی باہمی رقابت کو باقی رکھنا چاہتا تھا، اسی توازن قوت مین کلیسا کی بھلائی کا راز مضمر تھا،

ان منتشر و پراگندہ اور ایک دوسرے سے ٹکرا دینے والی یورپین ریاستون کی حکومت کا دارو مدار

لوٹ کھسوٹ پر تھا، غریب رعایا جو کچھ بھی اپنی محنت سے پیدا کرتی، اور کماتی تھی، اس کو محصولات، اور

ٹیکسون وغیرہ کے حیلون اور بہانون سے حکومت اور اس کے چند مخصوص کارندے سمیٹ کر اکٹھا کر لیتے

تھے، الغرض باشندے تو اس ملک کے بکھرے ہوئے تھے، مگر اس کی آمدنی چند خاص مرکزون مین سمٹ کر

ہر سال جمع ہو جاتی تھی، یورپ کی تاریخ کا یہی دور "قرون مظلمہ" یا "عہد تاریک" کے نام سے موسوم ہے، اور

یورپ کی تاریخ کے انہی تیرہ و تار دنون مین پائرنیز کے درون تک اندلس کے عرب مسلمان پہونچے، چنانچہ

اندلس اور اس کے اطراف و جوانب کی ریاستون سے بھی ان مسلمانون کی کشمکش شروع ہی سے جاری

تھی، اور پائرنیز کے درون سے گذر کر ان فراخ میدانون کی امارتون سے بھی دست و گریبان رہتے تھے،

۹۲ھ سے جو فتح اندلس کا سال ہے ۸۹۷ھ (۱۴۹۱ء) تک جب فرڈی نینڈ کے محاصرہ کے بعد غرناطہ کا سقوط

یعنی کم و بیش آٹھ صدیون تک اندلس کے مسلمانون اور یورپ والون سے مسلسل معرکون کے بعد معرکے ہوتے

رہے، اگر ان سب کی فہرست بنائی جائے، تو شاید کئی ہزار تک ان کی تعداد پہنچ جائے گی،

اس کا اجمالی اندازہ کرنے کے لئے یہ تاریخی مثال کافی ہو سکتی ہے کہ مروانیون کی مرکزی حکومت

کے آخری دور اور نام نہاد مروانی خلیفہ المؤید یا بعد کے عہد مین قاضی ابن عامر کے ہاتھ مین حکومت

کی باگ تھی، اس ابن عامر کے متعلق ہمارے مورخین نے لکھا ہے کہ

"اپنے ۲۶ سال کے دور حکومت مین صرف ابن عامر کو (۵۲) معرکے یورپین قومون

سے سر کرنے پڑے، (کامل ابن اثیر ص ۲۲۵)

یعنی سال مین دو حملے کے اوسط سے قاضی ابن عامر اور اُن کی فوج یورپین علاقون کو اپنا تختۂ مشق بنائے

ہوئی تھی، اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ جس زمانہ مین مروانیون کی مرکزی حکومت عروج و شباب کے آخری نقطون تک

قوت و دولت کے اعتبار سے پہونچی ہوئی تھی، اس زمانہ مین عرب فاتحون کی تگ و تاز کا کیا حال

ہو گا، (۲۶) سال کی حکومت مین ایک آدمی جب باون (۵۲) باون چھاپے مار سکتا تھا، تو اندلس کے ان متعدد

اولو العزم مروانی فرمان رواؤن، اور کشور کشاؤن کے زمانہ مین جو کچھ بھی ہوا ہو گا، آج ہم اس کا

اندازہ بھی نہیں لگا سکتے،

تاہم اندلس کی مبسوط اور مفصل تاریخون سے کوئی چاہے تو ان جنگی مہمون کی فہرست بنا سکتا ہے کہ کئی

صدیون کی بے شمار لڑائیون مین الحرب سجال کے قاعدے سے ہمیشہ میدان مسلمانون ہی کے ہاتھ نہین

رہتا تھا، لیکن اندلس کی تفصیلی تاریخ کا مطالعہ جن لوگون نے کیا ہے وہ جانتے ہین کہ مروانیون کی مرکزی

حکومت جب تک قائم رہی، اور اس کے کچھ دن بعد تک بھی ننانوے فی صدی مہمون مین میدان عموماً

مسلمانون ہی کے ہاتھ رہا،

اسی یورپ پر جس کا حال آج جو کچھ ہے اسے ہم سب دیکھ رہے ہین، وہ زمانہ بھی گذرا ہے جب

مسلمانون کے مقابلہ مین اُن کے مقتولون کی تعداد تین تین لاکھ تک پہنچ جاتی تھی، اسکی کثرت کو بتاتے

ہوئے ہمارے مورخین کبھی لکھتے ہیں کہ

جمع الرؤس اکد اساحتی کان
الفارس لا یری من یقابلہ،

مقتولون کے سرون کو بطور ڈھیر کے
جمع کر دیا گیا تھا کہ اتنی اونچی دیوار
ان سے تیار ہو گئی کہ گھوڑے کا سوار
بھی ڈھیر کے اس پار والے سوار کو نہین
دیکھ سکتا تھا،

(ج ۶ صفحہ ۱۰۲)

اور لاشون کے پشتون پر اذان دینے کے واقعہ کا اعادہ تو ان تاریخون مین اتنی دفعہ کیا گیا ہی کہ گویا اندلس کے مسلمانون کی یہ ایک عام عادت ہوگئی تھی،

مقتولون کے ساتھ قیدیون کی تعداد بھی ہزارون سے کم نہین بتائی جاتی، قاضی ابن عامر ہی کے زمانہ مین جو بڑا معرکہ فرانسیسیون سے پیش آیا تھا لکھا ہی کہ

اجتمع من السبی ثلاثون الفاً، — تیس ہزار قیدی اکٹھے ہوگئے،

(جلد ۹ صفحہ ۱۲)

یہی یورپ جو آج ساری دنیا کو اپنے جال مین پھنسائے ہوئے ہے، اس کا ایک زمانہ تو یہ تھا اسکے مقابلہ مین مسلمانون کی یہ حالت تھی کہ

"مروانی حکمران ہشام بن عبد الرحمٰن کی حکومت کے زمانہ مین ایک صاحب نے مرتے وقت یہ وصیت کی کہ میرے متروکہ مال کے ایک حصہ سے فدیہ دے کر مسلمان قیدیون کو چھڑایا جائے، اس کی موت کے بعد قاضی نے وصیت کے مطابق حکومت سے درخواست کی کہ دشمنون کے پاس اگر کوئی مسلمان قیدی ہو، تو اس کا پتہ چلایا جائے، تاکہ فدیہ کا روپیہ مال متروکہ سے الگ کرکے داخل کیا جائے،"

حکومت نے اس سلسلہ ممکنہ کی کاروائی جد و جہد کرسکتی تھی کرتی رہی، لیکن تحقیق سے ثابت ہوا کہ

لم یوجد فی دار الکفار اسیر — غیر اسلامی حکومتون مین کوئی ایسا مسلمان

یشتری ویفک بضعف العدو — قیدی نہ ملا جسے فدیہ دے کر چھڑایا جائے،

قوة المسلمین — یہ دشمن کی کمزوری اور مسلمانون کی قوت کا

(جلد ۷ صفحہ ۱۹) — حال تھا،

میرا مقصود مورخ کے آخری الفاظ یعنی "ضعف العدو و قوة المسلمین" کا ایک اجمالی نقشہ

ان سرسری معلومات کی روشنی مین پیش کرنا ہے،

ذرا خیال کیجئے ایک ایک جنگ مین مسلمانون نے تیس تیس ہزار یورپین قید کئے ہین، اور مسلمانون کا حال یہ ہے کہ حکومت اپنے سارے ذرائع سے کام لینے کے بعد بھی کسی ایسے مسلمان کا پتہ نہ چلاسکی، جو یورپ کی لڑنے والی قومون کی قید مین ہو،

اختتام جنگ کے بعد بسا اوقات یورپ کی شکست خوردہ حکومتین اپنے قیدیون کو بڑی بڑی رقمین پیش کرکے قید سے چھڑایا کرتی تھین، ابن اثیر نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ ایک یورپین امیر جو مسلمانون کے ہاتھ مین قید ہوگیا تھا،

افتدی نفسه منهم بتسعین — نوّے ہزار اشرفیان دے کر اپنی گلوخلاصی

الف دینار، (جلد ۷، ص ۲۰) — اُس نے کرائی،

یہ واضح رہے کہ طلائی سکہ یعنی نوّے ہزار دینار کی رقم روپیہ کی شکل مین کئی لاکھ تک پہنچ جاتی ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ ایک ایک قیدی کے زرِ فدیہ مین کبھی کبھی ایسی خطیر رقمین بھی وصول ہوتی رہتی تھین، اور یہ رقم غنیمت کے ان اموال کے سوا تھی جن کا ذکر کرتے ہوئے عموماً مورخین:

لا یعلمه الا الله، — نہیں جانتا ہے اُن کی مقدار اور تعداد کو
مگر صرف اللہ تعالیٰ،

لکھا کرتے ہین، جس کا صحیح اندازہ نہین کیا جاسکتا تھا،

یورپ کے ان سپاہیون کے ضعف، جبن، بزدلی، اور کم ہمتی کی کیفیت یہ تھی کہ ایک دفعہ شمال افریقہ کے صحرائی بربری مسلمانون کی ایک ٹولی وہان کی مقامی حکومت سے خفا ہوکر اندلس چلی گئی، قاضی ابن عامر نائب السلطنتِ مروانیہ کا زمانہ تھا، اس کی صحیح تعداد تو معلوم نہ ہوسکی، لیکن ایک ٹولی سے زیادہ حیثیت ان بربری مسلمانون کی نہ تھی، قاضی ابن عامر نے ان لوگون کو اپنے یہان ٹھہرالیا، کچھ دن گذرنے کے بعد ان

لوگوں نے قاضی صاحب سے عرض کیا کہ ہم لوگ اندلس میں بے کار بیٹھے بیٹھے کب تک دن گزاریں، اور اندلسی مسلمانوں کی اس چراگاہ کی طرف اشارہ کیا، جو برنیز کے دروں سے گذرنے کے بعد ملتی تھی، قاضی نے ان کی مرضی کے مطابق اندلس کی حکومت کے فوجیوں کو بھی ان لوگوں کے ساتھ کر دینا چاہا، لیکن ان بربری مسلمانوں نے انکار کیا، اور عرض کیا کہ ہم جتنے کچھ بھی ہوں، دشمنوں کے لئے کافی ہیں، البتہ کچھ ساز و سامان سے مدد کر دیجئے، چنانچہ گھوڑے اور اسلحہ کا انتظام اُن کے لئے کر دیا گیا، اور یہ لوگ دروں سے گذرتے ہوئے اس علاقہ میں پہنچ گئے، جہاں گال قوموں کا دار السلطنت تھا، رات کو ایک باغ پر حملہ کیا، لوگ شہر سے نکل پڑے بربری کسی ٹیلے کی آڑ میں چھپ گئے، اور جب شہر والے اس ٹیلے کے آگے نکل گئے، تو پیچھے سے تکبیر کا نعرہ بلند کرتے ہوئے ان پر جا پڑے، دشمن کے آدمیوں نے خیال کیا کہ کوئی بڑی فوج اُن کے ساتھ ہے، اس کے ہاتھ پاؤں بھول گئے، اور بربریوں کی یہ ٹولی مظفر و منصور مالِ غنیمت کے ساتھ قاضی ابن عامر کی خدمت میں پہنچ کر شاباشی[1] کی مستحق قرار پائی،

بعض واقعات ان ہی قاضی ابن عامر ہی کے سلسلہ میں ایسے بیان کئے جاتے ہیں کہ بے ساختہ آدمی کو ہنسی آجاتی ہے، اور خدا کی شان نظر آتی ہے، یہی یورپ ایک زمانہ میں کیا تھا، اور آج وہ کیا ہو گیا ہے، ایک دفعہ خود قاضی ابن عامر برنیز کے دروں سے اپنی فوج لے کر فرانس میں داخل ہوئے، اور تاخت و تاراج کرتے ہوئے اندرون ملک میں دور تک گھستے ہی چلے گئے، فرانسیسیوں نے ان قبائلی ریاستوں کے آدمیوں کو ملا لیا جو برنیز کے ان دروں کے آس پاس آباد تھے، اور ان ہی کے ذریعہ برنیز کے پہاڑی درّے اس طریقہ سے بند کر دیئے گئے کہ مسلمانوں کیلئے واپسی ناممکن ہو گئی، قاضی صاحب کو وقت پر خوب سوجھی، اپنی فوج کے آدمیوں کو حکم دیا کہ جس کو جہاں موقع ملے، مکانات کی تعمیر اور کھیتی شروع کر دے، اور دوکانیں قائم کر دے،

غرض ایسے حالات پیدا کئے گئے جن سے یہی سمجھا جا سکتا تھا کہ مسلمانوں نے دروں سے باہر جانے کا

---

[1] ابن اثیر جلد ۹ ص ۱۱

خیال ہی چھوڑ دیا، اور یہاں مستقل طور پر توطن پذیر ہو جانے کا فیصلہ کر لیا ہے، فرانسیسیوں نے یہ رنگ دیکھا تو اُن کے ہوش اڑ گئے، وہ مسلمان جو دروں سے گذرنے کے بعد اُن کے ملک پر ہر سال مصیبتیں توڑا کرتے تھے، اگر اُن کے ملک ہی میں آباد ہو جائیں گے، تو کیا قیامت ڈھائیں گے، یہی سوچ کر اسی وقت اُن کے سفراء قاضی صاحب کے پاس پہنچے کہ درّے کھول دیئے جاتے ہیں، آپ لوگ واپس تشریف لے جائیں، لیکن ہمارے ملک کی کوئی چیز آپ کے ساتھ نہ جا سکے گی، یعنی غنیمت کے اموال واپس کر دیئے جائیں، قاضی صاحب نے یہ سن کر کہا کہ خواہ درّے کھولے جائیں یا نہ کھولے جائیں ہم لوگوں نے تو اب اسی پار مستقل توطن کا ارادہ کر لیا ہے،

تب سفراء نے کہا کہ اچھا مالِ غنیمت بھی ساتھ لے جائیں، اور کسی طرح ہمارے علاقہ سے نکل کر آپ دروں کے پار چلے جائیں، قاضی نے پھر بھی قیام پر اصرار کیا، بالآخر یورپین سفیروں نے یہاں تک کہہ دیا کہ

"اموالِ غنیمت بھی اپنے ساتھ لے جایئے، اس کے سوا ہم لوگ اور بھی اتنی رقم پیش کریں گے، آپ کے اموالِ غنیمت کی باربرداری کے لئے سواریاں بھی مہیا کرتے ہیں"

اس وقت قاضی صاحب نے قیام کے مصنوعی ارادہ کے فسخ کا اعلان کیا، اور حسب شرائط برنیز کے دروں سے سب کچھ لیے دیئے اندلس صحیح و سالم و غانم واپس پہنچ گئے، (ج ۸ ص ۲۲۵)

بہرحال "مسلمانان اندلس" کی ضخیم و طویل تاریخ سے ان چند جستہ جستہ شہادتوں کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ اس لئے آپکے سامنے پیش کر دیا ہے، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اندلس کی مروانی حکومت کی دولت و ثروت جس کے بل پر وہ آخری زمانہ میں عباسی خلفاء کے ساتھ ہم چشمی اور ہم سری کی مدعی بن بیٹھی تھی، اور اس کی ساری اولو العزمیوں کا سرچشمہ اندلس کی سرزمین نہ تھی، جسے مسلمانوں نے چھوڑ دیا، بلکہ اندلس کی حیثیت تو گویا ایک اڈے کی تھی، اور دولت و ثروت کا طوفان جو اس ملک میں اُمنڈ آیا تھا، اس کا دہانہ اندلس سے باہر اس پاس کی ریاستیں اور برنیز کے دروں کے پار والے وسیع میدانوں والی یورپین حکومتیں تھیں، یورپ کی یہ حکومتیں اُن کے امراء، اہل کار اور کلیسا کے پادری یورپ کے عوام کو لوٹ لوٹ کر اپنے گھر بھرتے تھے، اور ان بھرے

ہوئے گھرون سے اندلس کے مسلمان جو کچھ جب جی چاہتا تھا، لے آتے تھے، وہ اُن کے لئے ایک ترنوالہ اور نہ ختم ہونے والا دفینہ تھا، جو اندلس کی راہ سے اُن پر منکشف ہوا تھا،

اس مین شک نہین کہ یہ جو کچھ کیا جاتا تھا، وہ اسلام اور کفر ہی کے نام سے کیا جاتا تھا لیکن کیا واقعی اسلام ہی کے لئے یہ جد وجہد تھی، اور اس کا انجام اندلس کے مسلمانون کے سامنے کیا اسی شکل مین آسکتا تھا جیسا کہ بعد کو آیا، اس مسئلہ کے اس پہلو پر ہم آیندہ بحث کرین گے، سردست صرف دو ہی نتیجون کی طرف پڑھنے والون کا ذہن منتقل کرنا چاہتے ہین، ایک تو وہی کہ جزیرہ نمائے اندلس کی جو اہمیت وہان کے مروانی حکمرانون کی دولت وثروت ووقار وعظمت کی داستانون کو سُنا کر پیدا کر دی گئی ہے، یا اُن کے بچے کھچے آثار کے دیکھنے والے اندلس کے متعلق جن غلط فہمیون مین مبتلا ہین، ان کا ازالہ ہو جائے کہ یہ جو کچھ تھا، اندلس کی بدولت نہ تھا، اس لئے اندلس کو ہم نے اگر کھویا تو کوئی ایسی چیز نہین کھوئی ہے، جس پر اتنا ماتم کیا جائے، اور خواہ مخواہ اس کے عشق کا آزار دلون مین پیدا کیا جائے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جیسا کہ آیندہ معلوم ہوگا کہ ہمارے لئے شاید وہی اندلس زیادہ مفید ثابت ہوتا، جس مین یہ سب نہ ہوتا، نہ الحمرا ہوتا، نہ الزہرا، نہ ہمارا قرطبہ اور نہ غرناطہ، مگر جو فرض آخر الامم ہونے کی حیثیت سے مسلمانون پر عائد کیا گیا ہے، اگر اس کو پیش نظر رکھکر کام کیا جاتا، تو آج سیاسی مصائب وآفات کے جن گردابون مین ہم تہ وبالا ہو رہے ہین، شاید یہ صورت حال پیش نہ آتی،

یورپین اقوام کے ساتھ اندلسی مسلمانون کی کش مکش کے سلسلے مین جن واقعات کا تذکرہ مین نے کیا، ہے سلطانی کو اپنے پدری حقوق سمجھنے والون کے لئے خواہ اُن کی نوعیت جو کچھ بھی ہو لیکن دین ہی کے سامنے نہین بلکہ عقل اور انسانیت کے سامنے بھی کم از کم میری گردن تو جھک جاتی ہے، درد کی اس داستان کو ہم آیندہ بیان کرین گے، اس کے سوا دوسری بات جس کی طرف توجہ دلانا ہے وہ یہ ہے کہ وہی یورپ جسے اندلسی مسلمانون کے مقابلہ مین آپ دیکھ چکے، ایک زمانہ مین کیا بنا ہوا تھا، اگر وہ جد وجہد سعی وکوشش کی سرگرمیون کی بدولت

عزت ووقار کی ان بلندیون تک پہونچ سکتا ہے تو مسلمانون کی موجودہ زبون حالیون کو دیکھ کر یہ کتنا غلط اور حد سے زیادہ قنوطی بلکہ شاید ابلیسی فیصلہ ہے کہ مسلمانون کی یہ پستیان بلندیون سے نہین بدل سکتی ہین،

سچ پوچھئے تو اندلس کی تاریخ کا یہی پہلو وہ ہے جس کو پیش نظر رکھتے ہوئے خوف اور دہشت کی جگہ جو اندلس کے لفظ کے سننے کے ساتھ ہی ہم مین پیدا ہو جاتی ہے، یا ان کیفیات کے پانے کے ہم عادی بنا دیئے گئے ہین قطعًا اُن کے برعکس ہم تو اپنے اندر امید اور رجا ہی کی روشنی پاتے ہین، یقینًا اس گئی گذری حالت مین بھی دنیا کے مسلمان قرون مظلمہ کے یورپین باشندون سے بہرحال بہتر ہین، ان بدترین حالات سے نکل کر جب موجودہ بہترین حالات تک یورپ والے پہنچ سکتے ہین، تو مسلمانون کو روح اللہ سے اپنے آپ کو بلاوجہ مایوس بنانے کی کوئی وجہ نہین،

ملتِ صابئہ و بدھ مذہب

از جناب حبیب اصغر صاحب قدوائی ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر علی گڈھ

رسالۂ معارف مین کچھ دنون سے یہ بحث چھڑی ہوئی ہے کہ آیا بوذاسف اور بدھا ایک ہی شخص اور ملت صابئہ اور بدھ ازم ایک ہی تحریک کے دو نام ہین،

یہ ایک علمی اور تاریخی بحث ہے جسکی اصلیت بہت کچھ ماضی بعید کی تاریکی مین گم ہے، اس لئے اس پر خامہ فرسائی کرنے کی "لم ولا نسلم ولا نسلم" اور دوسرے قسم کے سوال و جواب سے چارہ نہین، علمی دنیا مین جتنی ترقیان ہوئی ہین، ان ہی سوالات کی بدولت ہوئی ہین، ان سے نہ علمار دست بردار ہو سکتے ہین نہ جہلا، ان سوالات پر برا ماننا مناسب نہین، اختلاف رائے کو ترقی کے لئے بہرحال وسیلۂ رحمت سمجھنا چاہئے، اس مختصر تمہید کے بعد حسب ذیل گذارشات کی جرأت کر رہا ہون،

(۱) گوتم بدھ پر دنیا کی بہت سی زبانون مین کتابین لکھی جا چکی ہین، اور بعض ہمارے مدارس مین بھی پڑھائی جاتی ہین، ان سے پتہ چلتا ہے کہ گوتم بدھ کا سنِ پیدائش تقریباً ۵۰۰ ق، م ہے، وہ قوم شاکیہ کی سلطنت کے چشم و چراغ تھے، جو نیپال کی سرحد پر واقع تھی، اور جس کا دار السلطنت کپل وستو تھا، ان کی جائے پیدائش لُمبنی گاؤن کے قریب کا ایک باغ تھا، اُن کے دولتمند باپ راجہ شدھودن اور ان کی مقدس مان مہامایا تھین جو کوئی راجہ کی بیٹی تھین، وہ گوتم بدھ کی پیدائش کے ساتوین روز ختم ہو گئین اور ان کو اُن کی سوتیلی مان نے جو اُن کی خالہ بھی تھین، پالا، اٹھارہ برس کی عمر مین ان کی شادی یشودھرا سے ہو گئی اور اُن کے ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام راہل تھا،

ان خانگی تفصیلات کے علاوہ، ان کی مزاجی کیفیت، اُن کا سلطنت چھوڑ کر لباس فقر اختیار کرنا تاکہ مصیبتون سے نجات دلانے کا راستہ معلوم کرین، اُن کا سنیاسیون سے مذاہبی فکر مین راجگیر اور گیا کے جنگلون مین چھ سال تک گشت کرتے رہنا، سخت قسم کی ریاضتین اور جسمانی تکلیفین برداشت کرنا اور بالآخر برگد کے ایک درخت کے نیچے وہ ہمہ تن گیان دھیان کے بعد بدھی پا کر فائز المرام ہو جانا اور اس کے بعد اپنے مذہب کی اشاعت کے لئے چالیس سال کوہستان ہمالیہ اور گیا وغیرہ کے علاقہ مین گھومتے رہنا اور ہزارہا لوگون کو مرید کرنا یہ سفر کی ضروری تفصیلات کے ہماری شدہ ادلہ تاریخ کا بہترین سرمایہ ہین، ان کی اخلاقی تعلیم کی ضروری تفصیلات بھی معلوم ہین، اور یہ بھی معلوم ہے کہ ان کی وفات ۴۸۳ ق، م مین بمقام کشن نگر واقع ہوئی،

وفات کے بعد ان کے مذہب کی جس طرح اشاعت ہوئی، اور اس کے جو آثار باقی رہ گئے ہین اُن کی تفصیلات بھی موجود ہین، غالباً ان مین سب سے زیادہ وقیع شہادت ان کتبات کی ہے جو اشوک نے چٹانون، غارون اور پتھر کے مینارون پر کندہ کرائے تھے، اس کے علاوہ اور چیزون پر بھی کتبات ملے ہین مثلاً کسیہ ضلع دیوریا مین بدھون کے ایک معبد کے دروازہ پر ایک بڑی سی گھنٹی لٹک رہی ہے جس پر اوپر سے نیچے تک کچھ کندہ ہے، یونانی، چینی اور مسلمان سیاحون کے سفرنامون مین بھی اس فرقہ کے حالات درج ہین، دربار میسور کی شایع کردہ کتاب ارتھ شاستر مین بھی جس کا مصنف چندر گپت موریہ کا وزیر چانکیہ یا کوٹلیہ ہے، ان کے حالات ملین گے،

اس کے علاوہ خود بدھ فرقہ ایک زندہ فرقہ ہے، جو چین، کشمیر، برہما اور ایشیا کے بعض دوسرے حصون پر چھایا ہوا ہے، ان کے عبادت خانے اب بھی آباد ہین اور ان کی تیرتھ گاہون کی طرف جاتریون کا تانتا بندھا رہتا ہے، ان کے مذہبی پیشواؤن مین اب بھی ایسے بہت ہین جن کا کام صرف مذہبی مراسم کی پابندی اور اپنے طریقہ پر عبادت مین لگے رہنا ہے، وہ بیرونی دنیا سے بہت کم میل جول اور تعلقات

رکھتے ہین، مگر یہ سب ہوتے ہوئے بھی دنیا کے ہر فرقہ کے حالات و واقعات کی طرح اس فرقہ کے حالات و واقعات پر بھی تحقیقات کی گنجایش ہی اور اُن مین ترمیم و تنسیخ اور اضافہ بھی کیا جا سکتا ہی، مگر اس کے لئے شاعرانہ بلند پروازی کے بجائے قوی حجت اور معقول دلائل کی ضرورت ہے، اور یہ بھی ضروری ہی کہ ترمیم و تنسیخ کرتے وقت پچھلی کتابون اور پرانے واقعات پر جو یقینیات کا درجہ حاصل کر چکے ہین کامل طور پر رد و قدح کی جائے، خود بدھ فرقہ کے اکابر سے تبادلۂ خیالات کیا جائے، اور دوسرے اہلِ قلم کو آزادی رائے کے ساتھ تنقید کا موقع دیا جائے، اس کے بعد ممکن ہے اُس نتیجہ تک بھی رسائی ہو سکے جس کی تلاش ہے؛

(۲) جن بزرگ نے اس اہم سوال کو چھیڑا ہے، انھون نے فروری، مارچ اور ستمبر ۵۳ء کے رسالۂ معارف مین اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس یقین کی پہنچ گئے ہین کہ بوذاسف اور بدھ ایک ہی شخص کے دو نام ہین اور بدھ ازم وہی مذہب ہے جس کا عرب مورخین نے ملت صابئہ کے نام سے ذکر کیا ہے،

اگست ۵۳ء کے رسالہ مین ایک دوسرے بزرگ نے اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار پوری سنجیدگی اور متانت سے کیا ہے، اور چونکہ اس سوال کا دینی مسائل سے گہرا تعلق ہے، اس لئے انھون نے مختصراً وہ تمام صحیح اصول جمع کر دیئے ہین، جن کو پیش نظر رکھ کر اگر اس سوال پر غور کیا جائے گا تو گمراہی کا اندیشہ باقی نہ رہے گا وہ بزرگ اس بات سے متفق نہین ہین کہ بوذاسف اور بدھ دونون ایک ہی شخص کے نام ہین، یا بودھ ازم اور ملت صابئہ ایک ہی دین ہے، وہ فرماتے ہین:-

کوئی شہادت ہمارے پاس ایسی نہین ہے جس سے سمجھا جائے کہ بوذاسف بدھ کا معرب ہے، عربی کتابون مین جہان بدھ کے حالات لکھے ہین، وہان اس کو بدھ ہی سے تعبیر کیا ہے اور بوذآسف کو بوذاسف ہے، اس کے سوا اعلام مین تعریب نہین کرتے، بجز اس موقع کے جہان کوئی حرف ایسا ہو جو عربی مین نہین آتا، جیسے رام پور کی پ کو فا سے بدل کر رام فور کہتے ہین، کیونکہ پ عربی مین نہین ہے"

(معارف ماہ اگست ص ۹۹)

ان بزرگ نے اپنے دعوے کی دلیل مین شہرستانی اور مانی کی تصنیفات سے وہ عبارتین نقل کی ہین جن مین بدھ کا لفظ "بد" یا "بُدہ" کی شکل مین استعمال ہوا ہے، نہ کہ بوذآسف کی شکل مین، اس کے مقابلہ مین اول الذکر بزرگ نے کسی عربی تصنیف کی کوئی ایسی عبارت نقل نہین کی جس مین یہ لکھا ہو کہ بوذاسف اور بدھا ایک ہی شخص کے نام ہین، انھون نے فروری ۵۳ء کے رسالہ مین ص ۱۰۰ پر یہ ضرور لکھا ہے "بوذاسف بودھا کے لفظ کا عربی تلفظ ہے، عربی کتابون مین بودھا کا ذکر بوذآسف کی شکل مین کیا جاتا ہے" لیکن اس اہم دعوی کے ثبوت مین کوئی مثال پیش نہین کی ہے، ان ہی بزرگ نے ستمبر ۵۳ء کے رسالہ مین صفحہ ۲۰۵ پر لکھا ہے

"مسلمانون کی تاریخ کے اس حصہ کے طلبہ کے لئے بوذآسف کا بدھا ہونا تقریباً بدیہی مسئلہ ہونے کی حیثیت رکھتا ہی، رنگون کے ایک مذہبی طالب علم کا استدراکی بیان "صابئین" ہی کے بارے مین معارف ہی مین شائع ہو چکا ہے، انھون نے تو تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ یونانیون کے یہان سے مسلمانون مین بوذآسف کا یہ لفظ پہنچا،

مگر اس اطلاع سے زیادہ فائدہ حاصل نہین کیا جا سکا، اس لیے کہ اس مین نہ معارف کی جلد اور ماہ و سال کا حوالہ ہے اور نہ صاحبِ مضمون کے نام و پتہ کا،

مارچ ۵۳ء کے رسالہ مین ص ۱۶۶ پر ابوریحان بیرونی کی مشہور کتاب الآثار الباقیہ سے ایک عبارت بجنسہ نقل کی گئی ہے، اس مین بھی بوذاسف کا لفظ ہے، بدھا نہین ہی، اصل عبارت اس طرح شروع ہوتی ہے "بوذاسف قد ظہر عند مضی سنۃ من ملک طہمورث" لیکن اس کے اردو ترجمہ مین بوذاسف کے بعد بریکٹ مین "بودھا" کے لفظ کا اضافہ ہے، اور ترجمہ کے بعد دوسری سطر مین یہ عبارت بھی درج ہے، "الصابئین کی ملت کا داعی البیرونی کے نزدیک بوذآسف یعنی بدھا تھا"؛

حالانکہ ضرورت تھی کہ یہ بزرگ بھی عرب مصنفین کے شواہد خود اُن کی اصلی عبارت مین پیش فرماتے، ش

اس بنیاد پر جو عمارت کھڑی کی جائے گی، وہ ہمیشہ متزلزل رہے گی، اور جرح کا خیالی تیشہ بھی اس کو مسمار کردینے کی لیئے کافی ہو گا،

(۳) بوذآسف کس زمانہ مین پیدا ہوئے؟ اس کے بارے مین دونون بزرگون نے تاریخی حوالے دیئے ہین، ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا زمانہ اس قدر قدیم ہے کہ اُس وقت نہ حضرت ابراہیم پیدا ہوئے ہون گے، جن کا زمانہ تقریباً ۲۱۰۰ ق م ہے اور نہ حضرت نوح (علی نبینا علیہما السلام) جو ان سے بھی بہت پہلے گذرے ہین، اس لیئے بدھا کو جو تقریباً ۵۶۵ ق م سے ۴۸۰ ق م تک اس دنیا مین تھے، بوذآسف سے بہت زیادہ بُعدِ زمانی ہے اور دونون ایک ہی شخص نہین ہو سکتے ہین،

(۴) ملت صابئہ کے بارے مین دونون بزرگون نے پُرانی تاریخ کے جو حوالے دیئے ہین اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بوذآسف نے دین صابئہ کو پہلی مرتبہ جاری کیا تھا، اور چونکہ بوذآسف اور بدھا ایک ہی شخص نہین ہین، اس لیئے ملت صابئہ اور بدھ ازم ایک ہی تحریک کے دو نام نہین ہو سکتے ہین،

اول الذکر بزرگ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ عرب بدھ مذہب کے پیرون کو صابئی کہتے تھے، مگر اس امر کی کوئی تائیدی شہادت اُن کے مضمون مین نہین ہے،

مارچ ۱۹۵۳ء کے رسالہ مین ص ۱۷۵ پر وہ خود فرماتے ہین، "اس کا جواب مشکل ہو کہ عرب اور اس کے علاقون مین بدھ مذہب کے پیرون کو لوگ صابئین یا صابئہ کیون کہنے لگے تھے، ممکن ہے اس علاقہ مین بدھ متی جن لوگون کے ذریعہ پہنچا ہو، اُن مین سے کسی شخص یا فرقہ کے نام کی طرف منسوب ہو کر یہ لفظ بنا ہو،

آگے چل کر ص ۱۷۶ اور ۱۷۷ پر لکھتے ہین،

"آخر بدھا کا لفظ جب بوذآسف بن سکتا ہے تو کیون نہ سمجھا جائے کہ صابی کا لفظ بھی کچھ اسی قسم کے الٹ پھیر و ردوبدل کے قصون سے متاثر ہوا ......
....

.... دعیان کچھ ادھر جاتا ہے کہ مشرقِ قریب یا عرب اور اس کے نواح مین شاید صاب صابئی مذہب کے داعی

کی تعبیر تھی، یعنی پہلا آدمی اُس علاقہ مین جو پہنچا، ممکن ہو اس کا اصلی نام طاط یا تات ہو اور صاب اُس کا دینی لقب ہو اور اُسی کی طرف منسوب ہو کر اُس کے ماننے والے صابئین کے نام سے موسوم ہون"

یہ عبارت خود ہی شاہد ہے کہ اس خیال کی بنیاد ایسے گمان پر رکھی گئی ہے جو گمانِ غالب کے درجہ تک بھی نہین پہنچا ہے،

اسی رسالہ کے صفحہ ۱۶۶ اور ۱۶۷ کے بعض اور حصے بھی قابلِ غور ہین، مثلاً

"بہارات کا لفظ بہار کے لفظ کی جمع ہے، اور معلوم ہے کہ بدھ مذہب کے دینی مراکز کی تعبیر بہار سے کی جاتی ہے، بہار کے صوبہ مین بودھ مذہب کے دینی مرکزون کی کثرت تھی، اس لیئے اس صوبہ کا نام ہی بہار ہو گیا، بلکہ جاننے والے جانتے ہین کہ وسط ایشیا کا شہر بخارا دراصل بہار ہی کے لفظ کی ایک شکل ہے، ایک زمانہ مین خراسان کا یہی شہر بودون کا مرکز تھا، بلخ کا بہار، تو مسلمانون کی آمد تک موجود تھا .... نوبہار ...
.. کے پرمکھ کا لفظ ہی عربی مین برمک بن گیا .... اصنام کے ساتھ فرخارات کا لفظ ظاہر ہو کہ فارسی لفظ بیکر کی عربی شکل ہو .... عام طور پر بخاری کلامی کتابون مین سمینہ کا لفظ مستعمل ہو جس کے متعلق یہ سمجھا دیا جاتا ہے کہ ہندوستانی متفکرین کے کسی خاص گروہ کی تعبیر ہے لیکن البیرونی کے اس بیان سے کہ خراسان مین بدھشتون کو یعنی بوذآسف کے پیرون کو شمنان کہتے تھے، یہ بات واضح ہو جاتی ہو کہ سمینہ اسی شمنان کی نسبت سے بنایا گیا تھا جس سے مراد بدھ متی کے لوگ تھے، اور بھی بہت سے جدید اکتشافات بیرونی کی اس اطلاع سے حاصل ہوتے ہین، جنکی تفصیل کا یہ ستان موقع نہین ہے"

اس عبارت کے متعلق جب تک اس کی ضروری تفصیل سامنے نہ آجائے کوئی صحیح رائے قائم نہین کی جا سکتی، لیکن ان تاریخی شہادتون سے جو دونون بزرگون نے پیش فرمائی ہین، یہ ثابت نہین ہوتا کہ بوذآسف اور بدھا ایک ہی شخص ہین، اس لیئے اس نتیجہ کا تسلیم کرنا بظاہر خلافِ انصاف ہے کہ سمینہ اور

بوذآسف کے پیرو بدھ متی کے لوگ تھے،

یہ سوال بھی بہت اہم ہے کہ آیا صابی کی نسبت مذہبی ہو یا نسبی؟

دونوں بزرگوں نے پرانی تاریخ سے جو حوالے دیئے ہیں، اُن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسبت بربنائے نسب ہے نہ کہ بربنائے مذہب،

دوسرے بزرگ نے اگست ۵۳ء کے رسالہ میں ص ۱۰۵ اور ۱۰۶ پر کلام پاک کی ایک متعلقہ آیت کے بارے میں کچھ تفسیری نوٹ لکھے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ نسبت نسبی ہے،

اول الذکر بزرگ نے اس مضمون کا جواب ستمبر ۵۳ء کے رسالہ میں دیا ہے، مگر اس تفسیر کے بارے میں کچھ نہیں لکھا اور اس سے اختلاف کی بظاہر کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی ہے، اس لئے ہم کو اس نتیجہ تک پہنچنے کا حق ہے کہ یہ نسبت نسبی ہو اور یہ کہ اول الذکر بزرگ کو بھی اس سے اختلاف نہیں ہے،

باقی رہا یہ سوال کہ بدھ ایسی بڑی قوم کا ذکر کلام پاک میں کیوں نہیں آیا؟ یہ اور اسی قسم کے دوسرے سوالات ایسے بزرگوں کو پیدا کرنا مناسب نہیں ہے، جو کلام پاک کے انداز بلاغت سے واقف ہیں، ورنہ پھر سوالات کا میدان بہت وسیع ہو جاتا ہے، دنیا میں بہت سی بڑی بڑی قومیں گذر چکیں اور موجود ہیں، اور بہت سی ایسی کتابیں، اور صحائف جو نازل ہو چکے فی الحال ہمارے پاس موجود نہیں ہیں، مگر ممکن ہے آئندہ کسی مدفون آبادی کے کھدنیکے وقت دستیاب ہو جائیں، اُس وقت اُن پر بحث و تبصرہ ہوگا، آج بھی وید، پُران اور گیتا وغیرہ کے بارہ میں لوگوں کے خیالات مختلف ہیں، اور ان پر یقین رکھنے والے بھی بکثرت ہیں، اُن میں سے ہر ایک کی جانب سے یہ شکایت کی جاسکتی ہو کہ اس عظیم الشان کتاب میں اُن کا ذکر کیوں نہیں ہو،

یہ مسلم ہے کہ قرآن پاک دنیا کی تاریخ نہیں ہو بلکہ دین فطرت کے ان اصولوں کا مجموعہ ہے، جن پر فلاحِ دارین کا دارومدار ہے، اور جن پر سمجھ کر عمل کرنے سے انسان نہ صرف دنیا کی تاریخ بہترین طریقہ پر

جمع کرنا سیکھ سکتا ہو بلکہ اور تمام علوم و معارف اور خلقت کے راز بطریق احسن آشکارا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور اُن سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے،

اس عظیم کتاب میں ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں ضرورت داعی تھی، چند بھائیوں کا ذکر کیا گیا، جہاں صرف ایک کی ضرورت تھی، وہاں صرف ایک انسان کا ذکر کیا گیا اور جہاں ضرورت نہ تھی وہاں بڑی بڑی آبادیوں اور بڑے بڑے واقعات کو نظر انداز کر دیا گیا ہو اور یہ اس کتاب کی شان کے عین مطابق ہے،

اول الذکر بزرگ نے یہ بات تسلیم کر لینے کے بعد کہ "الصابئین کے لفظ سے عرب اور مکہ کے لوگ صرف مانوس ہی نہ تھے بلکہ یہ لفظ عام طور پر اُن میں مستعمل تھا اور اُنھوں نے یہ نام شروع زمانہ میں پیروانِ اسلام کو دیدیا تھا" تعجب کا اظہار فرمایا ہو کہ اسلامی دین کے قبول کرنے والوں پر یہ الزام کیوں عائد کیا گیا جب اور قومیں مثلاً یہودی، عیسائی اور مجوسی اُسی سرزمین پر موجود تھیں، اس کا ایک جواب انھوں نے مارچ ۵۳ء کے رسالہ میں صفحہ ۱۰۳ پر اس طرح سوچا ہے،

"ہو سکتا ہے کہ بدھ مت مذہب کے داعی بدھ متی کے نام سے جس دین کو پیش کر رہے تھے وہ مہاتما بدھ کی تعلیمات کے صحیح اجزاء کا ترجمان رہا ہو اور اس کو دیکھ کر مکہ والوں نے مسلمانوں کو صابی کہنا شروع کیا، مگر بظاہر جو واقعات ہم تک پہنچے ہیں اُن سے اسکی تائید نہیں ہوتی"،

لیکن میری رائے ناقص میں اہلِ مکہ کا یہ اقدام کچھ بھی محلِ تعجب نہیں ہو، وہ دینِ اسلام کا بالکل ہی ابتدائی دور تھا، اس لئے اہلِ مکہ گنتی کے چند پیروانِ اسلام کو اُس سرزمین کی کسی سربرآوردہ اور با اثر قوم سے مشابہت دیکر اُن کی اہمیت کو خود ان کی اور اُس قوم کی نظروں میں بڑھانا نہیں چاہتے تھے، اس لئے انھوں نے اُن کو اُس قوم سے مشابہ کیا جو غالباً اپنی حیات کی آخری منزلوں سے گذر رہی تھی اور جس میں وہ عناصر کسی حد تک نمایاں تھے، جن سے عرب قوم کی اکثریت تغافل برت رہی تھی اور اعلانِ اسلام کے بعد اُن کی دشمنی پر کمربستہ ہو گئی تھی یعنی توحید کا عقیدہ (فروری ۵۳ء ص ۸۹) سارے انبیاء علیہم السلام

کا ماننا (فروری ۵۳ء ص ۹۸) اس ملت کے داعی بوذ آسف کا دعویٰ رسالت (فروری ۵۳ء ص ۹۹) اس مذہب مین زہد کی تعلیم اور معاد کا یقین (فروری ۵۳ء ص ۱۰۰) دن بھر مین پانچ دفعہ نمازین ادا کرنا (مارچ ۵۳ء ص ۱۷۴) تین نمازون کا فرض ہونا جو سب ملا کر اٹھارہ رکعتین بنتین، ہر رکعت مین سجدہ، ہر نماز کے لیے طہارت اور وضو کا اہتمام، غسل جنابت، نکاحون اور حدود مین مسلمانون کے مشابہ ہونا (اگست ۵۳ء ص ۱۰۵) جن تاریخی حوالون سے یہ واقعات نقل کیے گئے ہین، ان مین کچھ باتین ایسی بھی ملتی ہین جو مسلمانون سے مختلف ہین، مثلاً ہر رکعت مین تین سجدے یا سورج کے رخ نماز پڑھنا،

لیکن تشبیہ دینے کے لیے مماثلت تامہ ضروری نہین ہے، ہم بھی کسی کو شیر، کسی کو رستم، کسی کو حاتم، کسی کو بحر العلوم، کسی کو شمس العلماء، کسی کو بلبلِ شیراز، کسی کو طوطی ہند، کسی کو نیچری، کسی کو فرعون بے سامان اور بہت سے کوٹ پتلون پہننے والے مسلمانون کو مختلف زمانون مین ادنیٰ مشابہت کی بنیاد پر کرسٹان کہہ چکے ہین، اور کہتے رہتے ہین، اور صابئین مین تو مسلمانون کی بہت سی خصوصیتین تھین، اس لیے ان کے ساتھ ان کی تشبیہ بہت کچھ صادق آتی ہے، لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ تعریف ان کی عزت بڑھانے یا ان کو نمایان کرنے کے لیے نہین کی گئی تھی، بلکہ اس کے برعکس مقصد کے لیے یعنی ان کو ایسے گروہ مین شامل کرنے کے لیے جو بالکل ناقابل التفات تھا، لیکن جب وحی آسمانی کے ذریعہ ان کی حمایت کی گئی جیسا کہ اکثر ہوتا رہا ہے تو نہ صرف ان کی عزت افزائی بلکہ خود صابئین کی بھی عزت افزائی مین کوئی شبہہ باقی نہین رہا، اور سچائی کے وہ تمام پہلو نمایان ہوگئے جن پر کسی قوم کی عزت کا دار و مدار ہے،

(۵) جن بزرگ نے یہ سوال اٹھایا ہے وہ بلاشبہہ مستحق مبارکباد ہین کہ انھون نے وقت کی ایک اہم ضرورت کی طرف توجہ فرمائی ہے، دنیا کے سب لوگ اگر صداقت اور امین بننے کا دل سے عہد کرلین تو ان کا فطری رجحان اور عقل سلیم دونون یہ حقیقت ان پر منکشف کردین گے کہ کائنات کا ہر ذرہ موت سے گھرا ہوا اور مردون کی طرح بے اختیار ہے لیکن تھوڑے عرصہ کے لیے اپنی طاقت و اختیار سے نہین بلکہ ایک قادر و توانا کے قوم

ذات پاک کے اختیار و حکم سے مخلوق ہو کر زندہ ہوا، اسی نے اس کو ساری جسمانی و دماغی طاقتین اور اختیارات عطا فرمائے، اور کام کرنے اور دنیا کو آباد کرنے کی صلاحیتین بخشین، اور اسی کی طرف ہم کو واپس جانا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جائیگا کہ ہر چیز کی سلامتی و ترقی کے لیے ضروری ہے کہ وہ قوانین فطرت کے مطابق زندگی بسر کرے مگر ان قوانین کا معلوم کرنا انسان کی طاقت سے باہر ہے، اس لیے اُن کو خود خالق کائنات اپنے پیغمبرون (علیہم السلام) کے ذریعہ دنیا والون کے مختلف گروہون کو حسب ضرورت بھیجتا رہا، یہان تک کہ جب وہ وقت آیا کہ دنیا کی آبادی کو بھائیون کی طرح مل جل کر زندگی بسر کرنی چاہیے، اس وقت وہ مکمل قانون بھی آگیا جو تمام دنیا پر ہمیشہ نافذ رہیگا، اور باقی قوانین جو پہلے نازل ہو چکے تھے وہ اس طرح منسوخ کر دیئے گئے کہ ان مین کا کوئی بھی اب اپنے اصلی حال مین محفوظ نہین ہے، مگر جو قانون پہلے نازل ہو چکے تھے وہ سب اسی طرح سچے تھے جیسا کہ آخری قانون ہے، اور ان کے لانے والے بھی سب کے سب سچے رسول تھے،

ان قوانین پر عمل کرنے والون کو یہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ زندگی اور موت کی کشمکش کا یہ عالم محض ان کی آزمایش کے لیے ہے، اس عالم مین وہ جو اچھے کام کرینگے ان کا اچھا بدلہ اور جو کام برے کرینگے ان کا برا بدلہ، موت کے بعد جو عالم آنے والا ہے اس مین اُن کو ملے گا، اور آخری قانون کے آنے کے بعد دنیا کی ہدایت کے لیے ایک ایسی قوم بھی تیار کر دی گئی جس نے اس پر عمل کیا، اور دنیا کی دوسری قومون سے کہین زیادہ لوگون کو بھائی بھائی بنانے، اخلاق حسنہ سکھانے، عدل و انصاف کے قائم کرنے، امن و امان کی زندگی بسر کرنے، مالک حقیقی کی ثنا و صفت بیان کرنے، اسکی عبادت کرنے اور اطمینان قلب حاصل کرنے مین کامیاب ہوئی، اس نے آنے والی قومون کے لیے اپنے بہترین نقش قدم چھوڑے، اور نہایت اطمینان و سکون سے آخرت کی زندگی کی بہترین مسرتون کا یقین کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوگئی،

اس موقع پر یہ حقیقت بھی واضح کر دینے کی ضرورت ہے جسکی طرف دوسرے بزرگ نے اگست ۵۳ء کے رسالہ مین صفحہ ۱۰۷ پر اشارہ کیا ہے کہ انسان کا ہر فرد اور ہر گروہ خواہ آج مشرک ہی کیون نہ ہو ایسے اچھے

تنقید نقشِ جمیل پر ایک نظر

از

جناب شمیم حمید بی عظیم آبادی

تنقید جہاں تصنیفِ زیرِ بحث کے حسن و قبح کی آئینہ دار ہوتی ہے، وہاں تنقید نگار کی وسعتِ نظر اور معلومات کی بھی غماز ہوتی ہے، فنِ تنقید پر اردو میں بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن حال یہ ہو رہا ہے کہ کوئی طرّۂ امتیاز نام کے ساتھ ہوا اور بس قلم اٹھا کر جو جی میں آیا لکھ مارا، نہ تحقیق کی زحمت گوارا کرنے کی ضرورت ہے اور نہ مطالعہ کتب کی کوئی حاجت، اکتوبر ۵۳ء کے معارف نمبر ۴ جلد ۲، میں جناب سید ولی الرحمن صاحب کاکوی کے قلم سے "نقشِ جمیل پر ایک تنقیدی نظر" پڑھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ علامۂ وقت کے کلام میں اور فن کی ایسی پیش پا افتادہ غلطیاں ہوں، اور وہ بھی متعدد، اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ جب اہلِ علم و فن بھی فن کو آتنا سبک بنانے پر اتر آئے ہیں تو عوام کا کیا ذکر، محترمی ولی صاحب میرے استاذِ محترم کے پیر بھائی ہیں، اس لئے وہ میرے لئے واجب التعظیم لیکن ان کے احترام کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے بھی اُن کی تنقید میں مجھے بعض باتیں ایسی نظر آئیں جو خود قابلِ تنقید ہیں، اس لئے اپنے خیالات ظاہر کرنے پر مجبور ہو گیا،

معارف ص ۲۹۸ = (۴۳) ص ۱۱۴ ولی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"صحیح لفظ تنّور ہے جس میں نون مشدد ہے، بہ حرکتِ نون صحیح نہیں، قرآن پاک میں ہے، فار التنّور"

جمیل مظہری نے اکثر تنور کو تنور استعمال کیا ہے تنور بروزن مفعول ہے نہ کہ بروزن فعول"

میں بہ ادب عرض کرتا ہوں کہ قرآن پاک میں یقیناً فار التنّور ہے، سورۂ ہود میں پارہ ۱۲ – ع ۱۱ / ۳

کی اولاد ہے جو مندکرہُ بالا حقیقتوں کے حامل، پکے موحد، کسی نہ کسی آسمانی کتاب یا دستور العمل کے ماننے والے اور اس پر عمل کرنے والے تھے، مگر اُن کی آنے والی نسلوں نے اُن تعلیمات سے تغافل برتا اور اپنے معتقد راجہ کی محبت میں قبر پرستی، بت تراشی اور بت پرستی وغیرہ شروع کر دی اور رفتہ رفتہ پکے مشرک ہو گئے، کبھی کبھی چاند، سورج، ستاروں اور دوسرے مظاہرِ فطرت سے مرعوب و مسحور ہو کر ان کی بھی پرستش کی، مگر اب جب کہ دنیا علم و عمل اور عقل و دانش میں اس قدر ترقی کر گئی ہے، اس کو عقل سے کام لینا چاہیئے،" ان حقائق پر غور کر کے دیکھنا چاہیئے کہ وہ ان کے دل و دماغ اور فطرت کی قدرتی پکار ہیں یا نہیں، اگر ہیں تو ان کو اس آخری قانونِ فطرت میں وہ سب کچھ مل جائے گا جس کی آج امریکہ، یورپ، روس، اور ہر ملک کے دل و دماغ رکھنے والے صالح فطرت انسان کو تلاش ہے یعنی وہ مذہب جس کا بین الاقوامی نام ہی پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں سارے عالم کا زندہ مذہب ہوں اور جس کی کتاب اور جس کے رسول علیہ السلام کے ناموں کا بھی یہی اعلان ہے اور جس کو قبول کر لینے اور مضبوطی سے پکڑ لینے کے بعد دنیا میں بھائیوں جیسا میل قائم ہو کر امن و امان قائم ہو جائے گا اور جنگ و خونریزی جب تک فطری طور پر کم ہو سکتی ہے کم ہو جائیگی، اس کے بعد یعنی غالباً تیسرے درجہ کا اہم فرض وہ ہے جس کی طرف اول الذکر بزرگ نے توجہ دلائی ہے کہ

نہ صرف بدھ قوم بلکہ انسان کی ہر اُس برادری کو جو آج کسی نہ کسی اخلاقی یا مذہبی کتاب یا تعلیم پر نازاں ہے، بتلا دینے کی ضرورت ہے کہ تمہارے اجداد اور پیشرو بھی ان ہی حقائق کے حامل تھے جن کا ابھی ذکر ہوا، اور اگر تم نے ان کی تعلیمات کو بالکل مسخ نہیں کر ڈالا ہے تو اسکی جھلک تم کو اپنے موجودہ نوشتوں میں ملے گی، دیکھو اور تلاش کرو، اگر مل جائے تو اسکی تائید سے تو می پشت ہو کر ورنہ اپنی عقلِ سلیم سے راہ راست تلاش کر کے ایسے واحد قانون پر عمل کرو جو اپنی فطری حالت میں زندہ ہے اور دنیا والوں کی ہر ضرورت کا فطری تقاضوں کے مطابق حل مہیا کر رہا ہے لیکن یہ کام طرح طرح کی مشکلوں، مذہبی تعصب اور نفی لغتوں کے طوفان سے گھرا ہوا اور ویسا ہی دیر انجام ہے جیسا کہ پہاڑ پر گرنے والا برف پتھروں کے گلا دینے میں ثابت ہوتا ہے لیکن بہر حال یہ ایک شریفانہ اقدام ہے اور دیندار مسلمانوں کی مخلصانہ ودیعۂ عادت کے عین مطابق ہے،

سوۃ الہوموں نیں (پارہ ۱۰ - اوج) لیکن بہ حرکتِ نون صحیح نہین، اس فقرے کے کیا معنی ہوئے۔ تنور کے نون کا خواہ سکون بتشدید کیجئے، یا بلاتشدید، دونون صورتون مین متحرک ہونا لازمی ہے، حرکت زیر زبر پیش کو کہتے ہین، اور جس حرف پر اُن مین سے کوئی حرکت آئے، وہ متحرک کہلاتا ہے، لہٰذا نون کا متحرک ہونا بہرحال ضروری ہے،

لفظ کی صحت کے لئے لغات ہین، یا اساتذہ کا کلام، انھی دونون سے اس کی تصحیح ہوسکتی ہے، اس لئے لغات سے اس لفظ کے بلاتشدید صحیح ہونے کی سند پیش کی جاتی ہے،

برہانِ قاطع :- تنور - بروزن ضرور لفظے است مشترک میانِ فارسی و عربی و ترکی بہ معنی محلِ نان پختن،

غیاث اللغات: تنور لفظ فارسی ست درصورت تشدید نون معرب آن، از "سراج" عبارتِ بالا سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اصل لفظ فارسی زبان مین تنور بلاتشدید نون ہے، معرب ہوکر بہ تشدید نون اہلِ عرب کے ہان استعمال ہوا ہے۔

جامع اللغات : تنور = فارسی مین بہ فتح اول وضم ثانی و عربی مین تنور بہ تشدید وضم نون،

اس مین شک نہین کہ اردو کے اساتذہ نے عربی کی تقلید مین تنور بہ تشدید نون بھی نظم کیا ہے،

ناسخ: خلق کے اعمال بد کرتے ہیں ایسا انقلاب — جائے آتش جوش پانی کا ہوا تنور سے

امیر مینائی :-

سب کو لنگر خانۂ خالق سے حصہ مل گیا — کیا میری قسمت کی روٹی جل گئی تنور مین

آباد لکھنوی:

تنے ہین اشک یوں دلِ سوزاں کے جوش مین — تنور سے وفور ہوا جیسے آب کا،

لیکن بہت سے اساتذہ نے اسے بلاتشدید بھی نظم کیا ہے، ملاحظہ ہو:-

مرزا طاہر وحید:

ز آب تنور است کارش روان — ازین آب می گردد این آسیا

(ز آب - فعولن، تنور س = فعولن، ت کارش = فعولن - روان = فعول)

سعدی: تنور شکم دم بہ دم تافتن — مصیبت بود روز نایافتن

(تنور = فعولن شکم دم = فعولن، بہ دم تا = فعولن، فتن = فعل)

انیس: وادی مین پیٹتی ہوئی آئی ہون دور سے — صورت دکھاؤ ماں کو نکل کر تنور سے

انیس: بالون پہ بن کی خاک پریشان دبے حواس — تھامے جگر جھکی ہوئی آئی تنور پاس

" ع آیا تنور مین تمھین یان کس طرح سے چین

" ع وادی تنور اور ترا سر ہے زا حیف

" رقت کا تھا یہ جوش کہ تھرا کے گر پڑی — دیکھا جو سر تنور مین غش کھا کے گر پڑی

شاد عظیم آبادی :

حدت سے بن گئے تھے کنوئین آہنی تنور — پتھر حجر کے دھوپ سے ہوتا تھا چور چور

تنور بروزن فعول قطعاً صحیح ہے، اور اردو مین اسی طرح نظم کرنا فصیح، فصحائے اردو بھی تنور ہی بولتے ہین، نہ کہ تنور بہ تشدید نون، اس لئے ایک صحیح لفظ کو خواہ مخواہ غلط ٹھہرانا مناسب نہین،

ص ۲۹۰ مین تحریر فرماتے ہین: "وادی مونث ہے، اور اس مصرعہ کا فاعل بھی وہی ہے، اس لئے تھا کی جگہ تھی ہونا چاہئے"۔ ملاحظہ ہو،

مفید الشعرا از جلال لکھنوی ص ۲۰، وادی - مذکر

معاون الشعرا از منیر لکھنوی ص ۴۹۹،

وادی - مذکر - ثبوت مین حضرت امیر مینائی کا مندرجۂ ذیل شعر پیش کرتے ہین،

وادئ قسمت پاؤں اپنے گئی تھک کر امیر — وادیِ مقصود جب دو چار منزل رہ گیا

وادی کو مذکر لکھدینے پر معترض ہونا سراسر زبردستی ہے،

[illegible]

صفحہ ۳۰۲ مین تحریر فرماتے ہین "کاکل بالاتفاق مونث ہے،

ذوق: ع خط بڑھا، زلفین بڑھیں، کاکل بڑھی، گیسو بڑھے،

مونث لفظ کو خواہ مخواہ مذکر لکھنے کی وجہ سمجھ مین نہین آتی"

کاکل یقیناً مونث ہے لیکن شاید ولی صاحب کی نظر سے غالبؔ مرحوم کا یہ شعر نہین گذرا، ورنہ جمیلؔ صاحب پر معترض ہونے کے پہلے غالبؔ پر نکتہ چینی کرنی چاہیئے تھی، جمیلؔ صاحب نے غالباً غالبؔ کی تقلید کی ہے،

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا	یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

ص ۲۹۲ مین ولی صاحب تحریر فرماتے ہین: "لفظ حرکت بہ سکونِ را صحیح نہیں، صحیح لفظ حرکت بہ فتحِ را ہے، غالبؔ:

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے	پرتو سے آفتاب کے ذرّے مین جان ہے

عربی مین یقیناً حرکت بہ فتحِ را لکھین گے لیکن اردو مین دونون طرح جائز الاستعمال ہے، ملاحظہ ہو،

ذوق: کبھی ثابت مرے نزدیک فلک کی گردش	کبھی ثبت مرے نزدیک زمین کی حرکت

حکمت اور ملت کے قافیہ مین نظم کیا ہے،

حالیؔ یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت	بڑھا جانبِ بوقبیس ابرِ رحمت

ص ۳۰۲ مین تحریر فرماتے ہین، "صحیح لفظ میّت بہ یائے مکسور ہے اس لئے اس کا قافیہ تربت صحیح نہین، ذوق، امیر، داغ، یا کسی اور مستند شاعر نے میّت کا تربت وغیرہ کا قافیہ نہین باندھا ہے؛

اتنا بڑا دعوےٰ اور اس بلند آہنگی کے ساتھ لیکن دیکھیئے خود ذوقؔ فرماتے ہین جن کے مستند ہونے مین غالباً ناقد کو بھی کلام نہ ہوگا،

ہل موسیقی ایسا کہ ادا کرتا تھا،	کبھی مین بارہ مقام اور کبھی چوبیس میت

نیّت اور شہرت کے قافیہ مین :

امیر اللہ تسلیم :-

الٹی ہوتین جو دعائین تیرہ قسمت مانگتا	داغ دیتا آسمان گر شمعِ تربت مانگتا
کچھ تو رہتا اتحادِ جوہرِ قاتل بعدِ مرگ	کاش آبِ تیغ بہرِ غسلِ میت مانگتا،

قسمت، تربت کا قافیہ میّت،

اہلِ زر کو ہو مبارک شمعِ تربت بعدِ مرگ	ہم جلائین گے چراغِ داغِ حسرت بعدِ مرگ
زندگی بھر ہم رہے ہر حال مین جن کے شریک	چھو نہین سکتے وہی تسلیمؔ میّت بعدِ مرگ

حالی: ہو اس طرح ہاتھون مین اس کے رعیت	کہ قبضے مین غسال کے جیسے میت

صاحبِ فرہنگ آصفیہ تحریر فرماتے ہین :-

مَیِّت: ع - اسم مونث (اردو والے بہ فتح یا بولتے ہین، اور یہی فصیح بھی ہے)

عربی پر اردو کا اعتبار کرنا قطعاً صحیح نہین، ہمارے فصحائے اردو مین جس لفظ کو جس طرح بولتے ہین اسی طرح اردو مین لکھنا اور نظم کرنا بھی فصیح ہے، یہ مسلمہ قاعدہ ہے ورنہ اردو پھر اردو باقی نہ رہے گی، مین اس سلسلے مین ادیب الملک نواب نصیر حسین خیالؔ مرحوم کے ایک خط کی عبارت پیش کرنا چاہتا ہون جو انھون نے استاذی حضرت حمید عظیم آبادی کو لکھا تھا، :

"لکھنو ۴ رجون ۱۹۳۱ء"

"عزیز والاشان - موجِ نسیم اور موجِ تسنیم (خط) دونون کا ساتھ شکریہ قبول کیجئے"

مشکل یہ ہے کہ اردو، فارسی اور عربی کے ذریعہ سے حاصل کی جاتی ہے ان زبانون کے دو چار بے ربط و بے موقع الفاظ زبان مین ٹھونس لئے اور زبان دان ہی نہین اہلِ زبان بن گئے"

دعاگو "خیالؔ"

آج کل بالخصوص فنِ عروض کی طرف سے جو بے پروائی برتی جاتی ہے، اس کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرانا نامناسب نہ ہوگا، اس سلسلہ میں بھی ولی صاحب نے جو اعتراضات کئے ہیں، وہ قابلِ تنقید نہیں، مثلاً :-

ص ۴۰۵ میں تحریر فرماتے ہیں :-

"شکستِ ناروا کی مثالیں بھی جمیل مظہری کے کلام میں بہ کثرت ہیں، اس عیب کی طرف بہت سے شعرا کی نگاہ نہیں جاتی ہے، بعض بحریں ایسی ہیں جن کے مصرعے مساوی ارکان میں منقسم ہوتے ہیں، مثلاً

ع تری گلی میں پہنچ گئے ہم تو یاد رکھ عمر بھر رہیں گے، — شاد

لیکن اگر تقطیع میں کوئی لفظ جو ٹکڑوں میں تقسیم ہوکر دو رکن سے متعلق ہو جائے، تو یہ عیب ہے اور ترنم پر اس کا برا اثر پڑتا ہے، مثلاً

ع سحر جو گھر میں بہ شکل آئینہ تھا میں بیٹھا نزار و حیران — ذوق

اس مصرع کی تقطیع یہ ہوگی :-

سحر جو گھر میں = مفاعلاتن، بہ شکل آئی = مفاعلاتن، نہ تھا میں بیٹھا = مفاعلاتن، نزار و حیران = مفاعلاتن = اس مصرعہ میں یہ لفظ آئینہ اس طرح واقع ہوا ہے کہ دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا ہے، اور اس کا جزو دوسرے رکن سے وابستہ ہو گیا، اس عیب کو شکستِ ناروا کہتے ہیں، جمیل مظہری کے بیسیوں مصرعوں میں یہ عیب موجود ہے"

اگر ذوق کے مصرع میں آئینہ شکستہ ہوکر "نہ تھا، میں بیٹھا" اور محترمی جمیل صاحب کے بیسیوں اشعار میں یہ عیب نظر آیا تو ناقد کو کھٹک سی پیدا ہوئی، لیکن انھوں نے جو اپنا فقط ایک ہی مطلع تحریر فرمایا ہے اس کے دوسرے مصرعہ میں انہی کے قاعدے سے شکستِ ناروا کی دو دو غلطیاں موجود ہیں، تقطیع ملاحظہ ہو،

ع بنا دے موت کو جو زندگی جینا اسی کا ہے،

بنا دے مو = مفاعیلن، ت کو جو زن = مفاعیلن، دگی جینا = مفاعیلن، اسی کا ہے = مفاعیلن =

وہاں تو صرف آئینہ شکستہ ہوا اور ناقد نے موت کے ساتھ ساتھ زندگی کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، اگر اس طرح کی گرفت کی جائے، تو شاید ہی کسی شاعر کی کوئی غزل اعتراض سے بچ سکے، تقطیع کے اصول میں یہ داخل ہے کہ لفظ کا ایک ٹکڑا دوسرے رکن میں آ سکتا ہے،

علم عروض میں جتنے ارکان ہیں، وہ یا پانچ حرفی ہیں، یا سات حرفی، دو پانچ حرفی ہیں، اور آٹھ سات حرفی، یہ آٹھ حرفوں کا رکن، مفاعلاتن، کس عروض کی کتاب سے لیا گیا ہے، اور یہ کون سی بحر ہے، ؟ مطلع فرمایا جائے،

علامہ شفق عماد پوری مرحوم نے میرے استادِ محترم کی کتاب جامع العروض کے تعارف میں اس غلطی کی طرف جو ولی صاحب سے ہوئی ہے، خاص طور پر اُن شعراء کی جو فن سے نابلد ہیں، توجہ مبذول کرائی تھی، تعارف کتاب

جامع العروض، مطبوعہ لاہور ص ۶،

ناسخ کی ایک غزل کا مصرعہ لیجئے،

ع :- نیامِ تیغِ قضائے مبرم لقب ہے قاتل کی آستین کا

اس کے اوزان تو یہ ہیں :-

"فعولن فعولن، فعولُ فعلن، فعول فعلن، فعول فعلن" مگر ایک صاحب نے اس کے اوزان یہ بتائے مفاعلاتن، مفاعلاتن، مفاعلاتن، مفاعلاتن، تقطیع بھی کر کے دکھا دی، اب ان سے کون کہے کہ حضرت یہ وزن ایجاد بندہ ہے، کسی بحر کا نہیں، بات یہ ہے کہ میزان کے لئے جو باٹ سنگ ترازو مقرر کر دیا گیا ہے، اس سے تولا جاتا ہے، نہ یہ کہ جس پتھر کو چاہا، اس کو پلے پر رکھ دیا،

ولی صاحب نے بحر کا نام تحریر نہیں فرمایا ہے، سنئے یہ بحر متقارب مقبوض اثلم شانزدہ رکنی ہے، فعول فعلن، فعولُ فعلن، فعولُ فعلن، فعول فعلن، ملاحظہ فرمایئے،

(۱) چراغ سخن از یگانہ چنگیزی (ص ۴۰، ۲) (۲) شجرۃ العروض از مظفر علی اسیر لکھنوی ص ۳۳

(۳) جامع العروض از حضرت حمید عظیم آبادی - ص ۶۶ (۴) عروض سیفی از علامہ سیفی صہ ۴۰

(۵) مخزن الفوائد از ملا محمد فائق :- بحر متقارب مقبوض، اثلم، شانزدہ رکنی، مثال مین یہ شعر پیش کیا ہے، مرزا بیدل گوید،

ودداع آرایشے نگین کن زشرم دامانِ حرص چین کن

مزن بہ سنگ از جنونِ شہرت چو نام عنقا وقار خود را

(۶) رسالۂ عروض از افضل العلما، مولوی محمد حسن مطبع مجتبائی دہلی، ۱۳۳۱ھ ص ۱۹ .

(۷) رکن عروض از علامہ شفق رضوی عماد پوری صہ ۱۹ (۸) قواعد العروض از علامہ قدر بلگرامی ص ۲۱۸،

عروض کی تمام کتابون مین بھی یہی تقطیع کی گئی ہے، جو مین نے کی ہے، طوالت کے خیال سے مین نے تمام کتابون کی عبارت مع تقطیع کے پیش نہین کی ہے، صرف صفحون کے حوالے دے دیے ہین، خود تو بحر تک کی خبر نہین اور دوسرون پر اعتراض کرنے کی جرأت قابلِ داد ہے،

محترمی وفی صاحب نے پروفیسر جمیل مظہری مدظلہ کی ملاقات کا جو واقعہ بیان کیا ہے، اور ان کی زبان سے اپنے مطلع کو حضرت شاد کے مطلع سے بہتر قرار دیا ہے، اُس کے متعلق مین صرف یہ عرض کر دینا چاہتا ہون کہ جمیل صاحب مدظلہ شعرون کی تعریف مین اس قدر غلو سے کام لیتے ہین، کہ وہ تعریف بھی ہجو ملیح تک پہنچ جاتی ہے، چند دن ہوئے جناب کاظم حسین صاحب زاد کے مکان پر ایک مشاعرہ ہوا، اس مین ایک صاحب اس مقطع کی تعریف مین جس کا دوسرا مصرعہ یہ تھا کہ ع تڑپ نہ جاؤ تو بسمل ہمارا نام نہین ؛ کہا، اب داغ کے اس مطلع کو جو زبان زد خاص و عام ہے، لوگ بھول جائین گے یعنی

کبھی فلک کو پڑا دل جلاون سے کام نہین اگر نہ آگ لگا دون تو داغ نام نہین

آپ نے آج سے داغ کے نام کو مٹا دیا، دوسری صاحب کی تعریف مین فرمایا کہ اب لوگ غالب اور اقبال کو بھول جائین، ممکن ہے جناب وفی کے مطلع کی تعریف بھی اسی انداز کی رہی ہو،

مبارق الازہار کس کی تصنیف ہے

از

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی

عبداللطیف بن ملک یا ابن فرشتہ ایک مشہور مصنف اور نامور عالم ہین، اُن کی تصنیفات مین مشارق الانوار کی شرح مبارق الازہار کو بہت شہرت و مقبولیت حاصل ہے، یہ شرح ... استنبول سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے، اس کے سوا اُن کی تصنیفات مین شرح مجمع البحرین فقہ میں، اور شرح منار اصول فقہ مین، بھی بہت متند اور علما مین متداول رہی ہین، مبارق الازہار کی نسبت قاضی سید نور الدین حسین صاحب نے معارف (جولائی ۱۹۴۹ء) مین اور ڈاکٹر سید باقر علی صاحب استاد شعبۂ عربی اسمٰعیل کالج بمبئی نے معارف (اکتوبر ۱۹۵۰ء) مین یہ انکشاف فرمایا ہے کہ وہ ایک ہندوستانی عالم کی تصنیف ہے، جو احمد آباد کے باشندے تھے، اُن کے والد کا نام عبدالملک جنبانی تھا، اور انکی وفات ۹۱۵ھ مین ہوئی، انکے صاحبزادے بھی عالم تھے اور ان کا نام خلیل محمد عباسی تھا، یہ نیا انکشاف معیارِ تحقیق پر پورا اترتا تو یقیناً ہماری معلومات مین ایک بڑا اہم اضافہ ہوتا، لیکن افسوس کہ تاریخی اعتبار سے وہ کسی طرح قابل تسلیم نہین معلوم ہوتا،

فاضل مضمون نگارون کے اس انکشاف کا مطلب اگر یہ ہے کہ عبداللطیف بن ملک اور عبداللطیف بن عبدالملک جنبانی دو شخص ہین، اور ان مین آخرالذکر مبارق کے مصنف ہین تو یہ ایک ایسا دعویٰ ہے، جس کی تائید کہیں سے نہین ہوتی، بلکہ اس کے برعکس وہ تمام مصنفین جنھون نے ابن فرشتہ کا حال لکھا ہے، یا جنھون نے مبارق الازہار کا ذکر کیا ہے، سب اس کو عبداللطیف بن الملک کی تصنیف بتاتے ہین، ملاحظہ ہو، الضوء اللامع، الشقائق النعمانیہ، اعلام الاخیار، شذرات الذہب، فوائد بہیہ، اتحاف النبلاء، کشف الظنون، اور مقدمہ

شرح وقایہ وغیرہ، بلکہ مبارق کے مصنف نے خود اپنے نام کی تصریح اس طرح کی ہے، وبعد فیقول العبد الضعیف العزیز عبد اللطیف بن عبد العزیز المعروف بابن الملک، (مبارق جلد ۱ صفحہ ۱)

اور اگر ان فاضل مقالہ نگاروں کی یہ مراد ہے کہ مبارق کے مصنف ابن فرشتہ ہی ہیں، مگر وہ وہی عبد الملک بنبانی کے لڑکے اور احمد آباد کے باشندہ ہیں، تو گذارش ہے کہ اس وقت جو کتابیں ہمارے پیش نظر ہیں، اُن میں سب سے پہلے ابن فرشتہ کا ذکر ہم کو الضوء اللامع میں ملتا ہے، اس میں اُن کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے: عبد اللطیف بن عبد العزیز بن امین الدین بن فرشتہ، سخاوی کے بعد طاش کبری زادہ نے الشقائق النعمانیہ میں اور اُن کے بعد کفوی نے اعلام الاخیار میں اور ابن العماد نے شذرات الذہب میں اور اُن کے بعد مولانا عبد الحی لکھنوی نے الفوائد البہیہ میں ان کا ذکر کیا ہے، اور سب نے اُن کے والد کا نام عبد العزیز بتایا ہے، یا صرف عبد اللطیف ابن الملک لکھا ہے، ان میں سے کسی نے اُن کے والد کا نام عبد الملک نہیں بتایا ہے، اسی طرح اُن کے دادا کا نام کسی نے محمود نہیں لکھا ہے، جیسا کہ ڈاکٹر صاحب معارف (اکتوبر سنہ ۵۰ء) میں لکھتے ہیں، بلکہ سخاوی نے اُن کے دادا کا نام امین الدین بتایا ہے،

تیسری چیز یہ ہے کہ یہ سب مصنفین اُن کو ابن ملک یا ابن فرشتہ لکھتے ہیں، الضوء اللامع میں ان کا جو سلسلہ نسب مذکور ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتہ ان کے پردادا کا نام تھا، مگر ڈاکٹر صاحب کے بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُن کے پردادا کا نام خضر تھا،

چوتھی غور طلب اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی اُن کے ہندی یا بنبانی ہونے کا ذکر نہیں کرتا، بلکہ طاش کبری زادہ کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تیرہ کے باشندہ تھے، لکھتے ہیں

کان رحمہ اللہ تعالی معلماً	(۱) امیر محمد بن آیدین کے
للامیر محمد بن ایدین وکان مدرساً	معلم اور شہر تیرہ میں مدرس
ببلدۃ تیرۃ[1]	تھے،

[1] الشقائق النعمانیہ ص ۲۳،

ان تمام امور کو سامنے رکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہیں کہ معارف کے محترم مقالہ نگار حضرات کو اشتباہ ہو گیا ہے، انھوں نے جن عبد اللطیف کا ذکر کیا ہے، وہ ابن فرشتہ اور شارح مشارق کے علاوہ کوئی اور بزرگ ہیں جن کے والد کا نام عبد الملک بنبانی تھا، وہ نسباً عباسی اور احمد آباد کے باشندہ تھے، مگر غلط فہمی سے اُن کو شارح مشارق تصور کر لیا گیا،

ہماری اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ معارف کے مقالہ نگار حضرات نے جن عبد اللطیف کا ذکر کیا ہے اُن کا سنہ وفات ۹۱۵ھ بتایا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ دسویں صدی کے علما میں ہیں، اور عبد اللطیف بن فرشتہ شارحِ مشارق دسویں صدی کے پیشتر کے عالم ہیں، سخاوی کا اُن کا الضوء اللامع میں ذکر کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ انھوں نے نویں صدی میں وفات پائی ہے،

یہ ہم جانتے ہیں کہ سخاوی نے اس کتاب میں بعض ایسے عالموں کا ذکر بھی کر دیا ہے، جن کی وفات دسویں صدی میں ہوئی ہے، مگر ان کا ذکر انھوں نے ایسے انداز میں کیا ہے کہ ہر شخص سمجھ لیتا ہے کہ جس کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ ابھی زندہ ہے، اور اس کے برعکس ابن فرشتہ کا ذکر جس پیرایہ میں کیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کی وفات ہو چکی ہے،

اور طاش کبری زادہ نے تو صاف صاف یہ ظاہر کر دیا ہے کہ وہ سلطان بایزید یلدرم کے عہد حکومت کے علما میں تھے، اور سلطان بایزید یلدرم کا عہدِ حکومت ۷۹۱ھ سے ۸۰۵ھ تک تھا، اور جب وہ اس عہد میں عالم کی حیثیت میں تھے یعنی یہ کہ وہ اس وقت کم از کم بیس پچیس سال کے تھے تو یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ انھوں نے ۹۱۵ھ میں وفات پائی ہو، اور سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ ابن العماد نے شذرات الذہب میں تصریح کر دی ہے کہ ابن فرشتہ کی وفات تقریباً ۸۸۵ھ میں ہوئی ہے[1]

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ شرح مشارق مطبوعہ استنبول کے سرورق پر جو

[1] شذرات الذہب ج ۷، ص ۳۴۲،

مصنف کا سالِ وفات ۹۰۹ھ لکھا ہے، وہ بھی مصححین کا وہم ہے،

حاصل یہ کہ مذکورہ دلائل وقرائن کی بنا پر ہمارے نزدیک محقق بات یہ ہے کہ عبداللطیف بن عبدالملک بنبانی احمد آبادی کی طرف مبارق الازہار شرح مشارق الانوار کی نسبت صحیح نہیں ہے، وہ عبداللطیف بن عبدالعزیز المعروف بابن الملک کی تصنیف ہے، جو نہ بنبانی ہیں، نہ احمد آبادی، نہ اُن کی وفات ۹۱۵ھ میں ہوئی، عبداللطیف احمد آبادی کوئی دوسرے بزرگ ہیں،

آخر میں معارف کے مقالہ نگار بزرگوں کو ایک اور بات کی طرف بھی متوجہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں، وہ یہ کہ ان حضرات نے عبداللطیف احمد آبادی کا جو سنہ وفات ذکر کیا ہے وہ بھی بظاہر صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ ڈاکٹر صاحب عبداللطیف کے والد عبدالملک بنبانی کی نسبت لکھتے ہیں کہ انھوں نے سنہ ۹۰۹ھ کے قریب قریب انتقال کیا، اور یہ بات قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ بیٹے کی وفات باپ سے ۵ برس پہلے ہوئی ہو، اِلّا یہ کہ کسی محقق تذکرہ نویس نے اس کی موجہ تصریح کی ہو،

بیٹے کے سنہ وفات کو صحیح قرار دینے کے لئے یہ احتمال بھی پیدا نہیں کیا جاسکتا کہ باپ کے سنہ وفات میں ممکن ہے غلطی سے آٹھ کے بجائے نو لکھ گیا ہو، اس لئے کہ عبدالملک بنبانی کتب احادیث کی روایت جار اللہ بن عبدالعزیز مکی سے کرتے ہیں، جیسا کہ ان اسانید سے جو ڈاکٹر صاحب نے نقل کی ہیں، ظاہر ہے، اور جار اللہ بن عبدالعزیز کی وفات ۹۵۴ھ میں ہوئی ہے، اور ولادت ۸۹۱ھ میں، پس اگر عبدالملک کا سالِ وفات ۹۰۸ھ قرار دیا جائے تو جار اللہ سے اُن کا روایت کرنا ممکن نہیں، نیز جار اللہ نے ۹۰۹ھ میں اپنے والد سے کتب ستہ کی سماعت کی ہے، تو لازم ہے کہ عبدالملک نے ۹۰۹ھ کے بعد جار اللہ سے سماعت کی ہو، اس بنا پر اُن کی وفات ۹۰۹ھ سے پہلے ممکن نہیں ہے،

دراصل اس غلطی کی بنیاد یہ ہے کہ قاضی سید نور الدین حسین صاحب نے مبارق الازہار کا مصنف ملک عبداللطیف داور الملک کو سمجھا، اور ان کا سالِ وفات ۹۱۵ھ لکھا ہے، اور ڈاکٹر صاحب نے عبداللطیف

بن عبدالملک بنبانی کو مبارق کا مصنف تصور کرکے یہ تخیل قائم کیا کہ یہ عبداللطیف وہی ملک عبداللطیف داور الملک ہیں، لہذا انھوں نے انکا سنہ وفات بھی ۹۱۵ھ لکھ دیا، حالانکہ یہ کسی طرح صحیح نہیں ہے، یہ دونوں دو عبداللطیف ہیں، عبداللطیف داور الملک کا شمار امرائے سلطان محمود بیگڑہ میں ہے، اور وہ حضرت شاہ عالم گجراتی کے مرید وخلیفہ ضرور تھے، لیکن کسی نے اُن کے مشغلۂ تدریس وتصنیف کا ذکر نہیں کیا ہے، نیز اُن کا سالِ وفات بھی ۹۱۵ھ نہیں ہے بلکہ صاحب مرآۃ احمدی نے ۹۰۷ھ میں اُن کی وفات بتائی ہے[1]

پھر اُن کے والد کا نام صاحب مرآۃ احمدی نے ملک محمود بتایا ہے، اور عبداللطیف بن عبدالملک بنبانی حضرت شاہ مقبول عالم گجراتی کے استاذ الاستاذ تھے، شاہ مقبول عالم کی ولادت ۹۸۹ھ میں اور وفات ۱۰۴۵ھ میں ہوئی ہے[2]،

ان دونوں کے علاوہ عبداللطیف بن ملک تیسرے بزرگ ہیں جن کی نسبت شوکانی نے بتصریح لکھا ہے:-

لہٗ تصانیف منہا شرح المشارق	ان کی متعدد تصنیفات ہیں، ان میں
.... وکان	سے ایک شرح مشارق ہے، ....
من علماء الروم الموجودین فی	.... اور وہ ایک رومی عالم تھے، سلطان
ایام السلطان مراد[3]،	مراد کے زمانہ میں موجود تھے،

---

[1] مرآۃ احمدی ج ۲ ص ۳۴، [2] ایضاً ص ۲، [3] البدر الطالع ج ۱ ص ۴۲،

آثار علمیہ و ادبیہ

مکاتیب ابوالکلام آزاد

بنام

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

(۲۲)

صدیقی الجلیل الاعز

انسان کا اپنا فرض نہ ادا کرنا ہمیشہ اس کے لئے موجب تاسف و تالم ہوتا ہی، اگر مین نے آپکے خطوط کا جواب دیدیا ہوتا تو آپ کو میری خاموشی سے سوء ظن نہ پیدا ہوتا، استغفر اللہ،

لیکن تعجب ہی کہ خطون کے بارے مین میری اس حالت کے علم کے باوجود آپ کو ایسا خیال ہوا حالانکہ ساری دنیا میری اس عادت سے واقف ہی اور یہ نئی بات نہین ہی،

مین رمضان اور اس کے بعد کے بعض حالات کی وجہ سے بہت ہی پریشان رہا، اور اب تک ہون اسی وجہ سے خط نہ لکھ سکا، اور آج کل پر وقت گذر گیا،

مین نے پہلے ہی لکھدیا تھا کہ کتاب جس طرح اور جس اصول پر آپ چاہیئے شائع کرائین، اصل مقصد اشاعت ہی، اور اگر مین اس کا ذریعہ ہوں تو یہ خوشی کی بات ہی،

کتاب کا دیباچہ طیار کر و تیجئے چھپ جائے گا، لیکن چند باتون پر نظر رہے،

۱- آپ کو میرا حال معلوم ہے، نیز پریس سے بھی واقفیت ہوگی،

۲- سر دست نیا ٹائپ کوئی نہین رہا، انسبۃ نئے یعن ہفتہ وار، اور پُرانے مین روزانہ نکلتا ہی، اب خود ڈھلوانے کے لئے کوشش کر رہا ہون، اس لئے نئے ٹائپکے خریدنے مین بھی وقت لگے گا، کیونکہ آوڈر سے ایک ماہ بعد مال دینے کا معاہدہ ہے، اور ہمیشہ معاہدے سے بھی زیادہ تاخیر ہو جاتی ہے،

۳- گورنمنٹ بنگال کی ایک کتاب چھپ رہی تھی، نصف باقی ہے جنگ کی وجہ سے روزانہ نکالنا پڑا، ان اسباب سے پریس بہت مصروف ہی،

پس اگر مین بہت کوشش کرون گا جب بھی کتاب اِس وقت سے ایک ماہ بعد شروع کی جا سکے گی؛ البتہ شروع ہو جانے کے بعد کسی نہ کسی طرح ہفتہ وار اقلاً دو جزء ضرور چھپ جائین گے؛ اس سے بھی زیادہ ممکن ہے،

آپنے ایک خط مین الہلال کے اغلاط آیات وغیرہ لکھے تھے، وہ بالکل ٹھیک تھے، کیا کہون آیات کے متعلق بعض اوقات عجیب حالت ہو جاتی ہے، الا ان حزب اللہ ھم الغالبون کے متعلق دماغ کو بحیثیت مجموعی دھوکا ہوا، فان حزب اللہ ھُمُ الغالبون اور الا ان حزب اللہ ھُمُ المفلحون کے تشابہ سے دماغ نے ھم الغالبون پیدا کر لیا، اور مادہ تاریخی ہونے کی وجہ سے بہت غنیمت معلوم ہوا،

حدیث بدء الاسلام غریبا کے الفاظ مین بھی واقعی غلطی ہو گئی، اگرچہ غریب کے معنی مین نہین، ہان یہ ضرور ہے کہ محدثین نے غربت سے فلاکت و ادبار و مغلوبیت و مظلومیت و مسکنت ضرور مراد لی ہے، حافظ ابن رجب صاحب طبقات نے .... لکھا ہی، اور چھپ گیا ہی، مختلف دلایل بھی جمع کئے ہین، اور لکھا ہی کہ تنزل مسلمین و مظلومیت حق و قلت صادقین و شیوع فسادات وغیرہ مراد ہین، مسافر کی حالت فقر و مسکنت و بے یاری و بے رفاقت کی ہوتی ہی، اسلئے اردو لفظ غریب کا مفہوم ہر حال مین پیدا ہو جاتا ہے،

مولوی عبدالسلام صاحب نے بالآخر اپنے سوانح و حوادث بیان فرما ہی دیئے، جو بڑے ہی دلچسپ ہین کاش آپ سنتے،

مولوی آزاد سبحانی کے متعلق اور لوگون کا بھی یہی بیان ہے، یہان بھی وہ آئے تھے، مین نہ تھا مولوی رکن الدین مین اور اُن مین سخت مجادلہ ہوگیا، انھون نے کہا کہ میری کامیابی میری قوتِ بیانیہ کا نتیجہ ہے، دانا صاحب نے نہ مانا، بیجاپور والے مضمون کا اس قدر تشکر کہ اس سے زیادہ ممکن نہین، باتصویر رسالہ کی یہ اصلی شے تھی، جو آپ کی بدولت الہلال مین شروع ہوگئی، جنگ کی وجہ سے وہ اب تک شروع نہ ہوسکا ورنہ بلاک بن گئے ہین، آیندہ اُن کے بعد والے نمبر مین انشاء اللہ شائع ہوگا، مگر اس کے بعد کا کوئی حصہ دیجیے، تاکہ تسلسل قائم رہے،

علم الحدیث کے مضامین تو الہلال مین نکل چکے ہین، اور آپ کن کی نسبت فرماتے ہین؟ علوم القرآن مین اور کچھ ملا،

"ابوالکلام"

(۴۳)

صدیقی العزیز   السلام علیکم

عرصہ سے آپ خاموش ہین، معارف کا جدید اہتمام دیکھ کر جی نہایت خوش ہوتا ہے، آپ کے پریس سے جامع الشواہد کا بل اب تک نہین ملا، برابر انتظار رہا، براہِ عنایت بھجوا دیجئے،

بالفعل ضروری بات یہ ہے کہ انجمن اسلامیہ رانچی کا دوسرا سالانہ جلسہ ۲۴-۲۵-۲۶- اکتوبر ۱۹ء کو قرار پایا ہے، اس سال آپ کی شرکت نہایت ضروری ہے، خواہ کچھ ہو، مگر آپ کو آنا ہی پڑے گا، اگر آپ شریک نہ ہوئے تو بڑا قلق ہوگا، بہار کا جو حال ہے، پوشیدہ نہین، رنگون تک سے لوگ آئے مگر خود اس صوبہ مین کسی کو توفیق نہ ملی، آپ ہی اس فرض کفایہ کو فرض عین بنایئے، کیا اچھا ہوتا، اگر آپ صوبہ بہار کی گذشتہ

علمی زندگی و تعلیمی حالت پر ایک ایسا لیکچر دیجئے (الفاظ مٹ گئے ہیں........................)

مولوی ابوالحسنات صاحب کو بھی ساتھ لایئے گو افسوس کہ عمادی حیدرآباد مین ہین، اور بلائے نہین جاسکتے، اور حادثہ کانپور پر بھی بڑا زمانہ گذر چکا،

ایک دن کا جلسہ صرف صوبے کے تعلیمی و علمی مذاکرہ کے لئے مخصوص کر دیا ہے، مولوی ابوالحسنات صاحب بھی کوئی تحریر طیار کرین تو بڑی خوشی ہو،

مشورۃً لکھیے کہ صوبہ بہار کے علماء مین کون کون قابلِ دعوت اور مستحقِ سعی خاص ہین؟ آپ لکھین گے کوئی نہین لیکن یہ جواب تو تمام ملک بلکہ تمام دنیا کے لئے بھی دیا جاسکتا ہے،

مولوی فضل حق صاحب کو ندوہ کے لئے دوبارہ لکھ چکا ہون، اب معلوم ہوا کہ انھون نے حکیم صاحب کو کوئی تحریر بھیجی ہے، اور جانے کے لئے مستعد ہین، دراصل مدرسہ عالیہ کی تنخواہین اُن کے پیش نظر ہین، چاہتے ہین کہ رامپور سے زیادہ توقعات ہون، تو اب نکلین، میرے خیال مین تو ضرور پرنسپل کی تنخواہ بڑھا دینی چاہیے،

"ابوالکلام"

(۴۴)

صدیقی العزیز   السلام علیکم:-

یہ تو اپنے کامل معنون مین کشف ہے، خود مجھے خیال ہوا تھا کہ تین سو کی تعداد کافی نہین، زیادہ ہوا لیکن اس لئے نہین لکھا کہ شاید کتابت رسالہ معارف در رسالہ کی ایک ہی رکھی گئی ہو، اور مئی نمبر کا حصہ قبل رسالہ بھی چھپ چکا ہو، بہرحال یہ خوب کیا کہ تعداد پانچ سو کر دی، علاوہ عبارت ہدایہ کے معمولی غلطیان کتابت کی بھی بہت تھین، امید ہے کہ درست ہوگئی ہون گی،

"ٹائٹل کے متعلق استصواب کی کیا ضرورت تھی، آپ نے خود کچھ لکھ دیا ہوتا، بہرحال اختصار کے

خیال سے مین نے صرف ادارت شرعیہ بنا دیا، سکریٹری انجمن کے اہتمام کی تصریح کی ضرورت نہین ہی،

لیکن دقت یہ ہی کہ آپ وطن جارہے ہین، اگر یہ خط آپ کی عدم موجودگی مین پہنچا تو کیا اعظم گڈہ

. . . . کوئی صاحب کھول کر ٹائٹل لکھنے کے لئے دیدین گے ؟ غالباً یہ آپ کو واپس د

مین ملے گا،

امید ہے کہ علاوہ رسالہ کے معارف مین بھی تصیح کردی گئی ہوگی،

مولوی فضل الحق صاحب رامپوری کی نسبت معلوم نہین ہوا، کہ ندوہ والون کا کیا قصد ہے اور

عبدالحی صاحب نے کیا جواب دیا، ادھران کا خط آیا تھا، امید ہی کہ آپنے مکرر لکھا ہوگا، جہان تک

معلوم ہی موجودہ مدرسین دارالعلوم مین سے کسی کو پرنسپل پر مقرر کرنا بہتر نہ ہوگا، کوئی مدرس ایسا نہین ہی، بالکل

غیر معروف آدمی کے ہونے سے مدرسہ کی شہرت و وقعت پر بھی مضر اثر پڑتا ہے،

ابوالکلام

۲۶ رمضان ۳۷ھ رانچی

(۲۵)

صدیقی الجلیل الاغر

انعم اللہ علی بلقائک

والا نامہ پہنچا، افسوس ہی کہ مجھے جناب کا وہ خط نہین ملا، دفتر مین پوچھا تو انکار کیا، سخت افسوس

آپ اس کا خلاصہ مکرر لکھنے کی زحمت گوارا فرماتے،

تاریخ عرب کے لئے حاضر ہون لیکن آپ میری حالت سے واقف ہین، ذمہ داری سے ڈرتا ہون

نوی حم کے چھپنے کی بھی گفتگو ہورہی ہے، مین سوا لکھنے پڑھنے کے کچھ نہین کرسکتا، آپ ایسا کیون نہ کرین

لکھنؤ مین چھپوائین، اور نقشے مجھے بھیجدین، یہان بن جائے گا، ٹائپ کے لوگ خوگر بھی نہین ہین،

علوم القرآن اتنا ہی تھا، اگر مزید سلسلہ مرحمت ہو تو نہایت ممنون،

ہان "الحریت فی الاسلام" کے چند نمبرو آپنے لکھے تھے، شاید آپ لے گئے، انھین ضرور ہی بھیجدیجئے اسی طرح

چھپ جائے گا، اور سلسلہ مکمل ہوجائے گا،

ندوہ کے متعلق حسب مقدور کر رہا ہون، آپنے بہت ہی خوب ہی کیا کہ وکیل مین اپیل شائع کی، اس وقت

ضرورت اس کی ہے کہ دیگر اخبارات مین مضامین نکلین، کاش آپ ایک دو مضمون لکھکر زمیندار مین بھیج دین،

"ابوالکلام"

(۲۶)

صدیقی العزیز

ترجمان القرآن کی پہلی جلد کسی نہ کسی طرح چھپ کر نکل گئی، آپ کو اس لئے نہین بھیجی گئی کہ خیال

تھا کلکتہ سے مجلد نسخے آجائین، تو بھجواؤن لیکن آج ایک تار سے معلوم ہوا کہ دو ہفتہ کی مزید دیر ہوگی، ادھر تو ٹیکل

حالات نے ایسی صورت اختیار کرلی ہے کہ نہین کہا جاسکتا کتنے دنون بلکہ گھنٹون تک جیل سے باہر رہ سکون گا،

اس لئے طبیعت نے تقاضا کیا کہ غیر مجلد ہی بھجوادون،

نسخہ شوق بہ شیرازہ نہ گنجد زنہار

بگزارید کہ این نسخہ مجزا ماند

امید ہے مع الخیر و عافیت ہون گے، مولوی عبدالسلام صاحب کے مشاغل کا کیا حال ہی؟

ملے ہون تو سلام شوق پہنچا دیجئے، مولوی مسعود صاحب نہین معلوم وہان ہین یا نہین، اگر ہوتے تو آپکے

ذریعہ کہلاتا کہ ٹوپیون کا اب تک انتظار ہے،

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ :-

ابوالکلام

دہلی دریا گنج ۶ ، ۱/۳۲

(۲۷)

۳۔ اسٹور روڈ۔ کلکتہ

۸ ۳/۳۲ء

صدیقی الاعز

امید ہے بخیر و عافیت ہون گے، مدت ہوئی آپنے لکھا تھا ابن تیمیہ کی الرد علی المنطق نقل کرائی ہے اگر نقل قابلِ اشاعت ہو، اور کسی وجہ سے شائع نہ کر سکتے ہون تو بہتر ہوگا شیخ محمد نمیر ازہری کے حوالہ کردی جائے، وہ ابن تیمیہ کی تمام بقیہ مصنفات شائع کرنا چاہتے ہین، اور الرد علی المنطق کے خواہشمند ہین، مین نے انھین قاضی شوکانی کی تفسیر فتح القدیر کی نسبت لکھا تھا، وہ انھون نے شائع کردی،

براہِ عنایت کتاب کی صورتِ حال سے مطلع کیجئے، مجھے جیل مین دورانِ سر کی شکایت ہوگئی تھی جس کی وجہ سے طبیعت بجد مضمحل رہی، اب گونہ افاقہ ہے،

مولوی مسعود صاحب اگر ہون تو سلام پہنچا دیجئے، معلوم نہین، مولوی عبدالسلام صاحب آج کل کہان ہین، اور کس عالم مین ہین،

والسلام علیکم

ابوالکلام

(۲۸)

۳۔ اسٹور روڈ۔ کلکتہ

۲۰ ۳/۳۲ء

صدیقی العزیز چونکہ ایک درخواست مین معارف کا حوالہ دیا گیا تھا، اس لئے خیال ہوا تھا کہ شاید کوئی تحریر نکلی ہے، اب معلوم ہوا وہ اشتہار تھا، آپنے اشتہار کی مزید اشاعت کے لئے جو آمادگی ظاہر کی ہو، اس کے لئے شکر گزار ہون،

خیام پر اگر کچھ آپ نے ..... لکھا ہے تو یہ بیکار کام کیون ہوا؟ خیام کے بعض رسائل کا مجموعہ

روس سے شائع ہو چکا ہے، کیا ان کے علاوہ نئے رسائل دستیاب ہوئے ہین؟ اگر غیر مطبوعہ رسائل ہین تو یقیناً یہ ایک قیمتی اضافہ ہوگا، انہین ضرور شائع کیجئے،

یادش بخیر، مولوی عبدالسلام صاحب آج کل کہان ہین اور کس عالم مین ہین؟ اگر اعظم گڈھ مین ہون تو سلام پہنچا دین، والسلام علیکم

"ابوالکلام"

(۲۹)

کلکتہ ۳ ۲/۳۲ء

صدیقی العزیز یو پی مین پونگ تو یہ تک ختم ہوجائے گی، اور پھر جو کچھ بھی ہو، آپنے اور دار المصنفین سے اس کا رشتہ سمجھ مین نہین آیا، زیادہ سے زیادہ آپ کا ووٹ ہوگا، جو آدھ گھنٹے مین آپ دے آئین گے، یا کسی دوست کے لئے ساعی ہون گے، تو جد و سعی کا زمانہ اب ختم ہو رہا ہے،

آپ لکھتے ہین، ۲۸ر فروری کے بعد موسم اچھا ہوجائے گا، اچھا کیا خاک ہوگا، گرمی شروع ہوجائے گی آپ کے اس مقدمہ سے مجھے قطعاً اختلاف ہے کہ موسم کی موجودہ حالت اچھی نہین، اور "اچھا موسم" اس وقت ہوگا جب اچھا موسم ختم ہوجائے گا،

براہِ عنایت مجھے بلا تاخیر مطلع کیجئے کہ لکھنو سے کب تک واپسی ہوگی، یا لکھنو سے جس دن چلئے مجھے تار دیدیجئے کہ اعظم گڈھ جا رہا ہون،

کیا آپ سمجھتے ہین مین نے مولوی عبدالرزاق صاحب کو نہین سمجھایا ہوگا؟ لیکن مین نے محسوس کیا کہ ان کی طبیعت نے دوسرا رنگ اختیار کرلیا ہو، اور اب نصح و تذکیر بے فائدہ ہے، ادھر عرصہ سے وہ ملا بھی نہین ان کا اخبار بھی میری نظر سے نہین گذرتا، کیا ادھر انھون نے اس قسم کا کوئی مضمون شائع کیا ہے،

والسلام علیکم، "ابوالکلام"

ادبیات

قطعۂ تاریخ

انتقالِ پُر ملال علامۂ عصر و فاضلِ دوران مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

از شاہ ولی الرحمن صاحب ڈپٹی کلکٹر

اے جن و انس ہے یہ قیامت کا حادثہ
رخصت ہوئی جہان سے سلیمانِ خوش خصال

یہ واقعہ مصیبتِ عظمیٰ سے کم نہین
یہ سانحہ قیامتِ کبریٰ کی ہے مثال

علم و ادب کی بزم ہے ویران و منفعل
خاموش ہو گئی ہے جو اک شمع بے مثال

عالم کی موت اصل مین عالم کی موت ہے
اک فرد ہی کی موت کا تنہا نہین سوال

ویران نہ صرف علم و ادب کا دیا ہے
ہے بلکہ مرغِ ملتِ بیضا شکستہ بال

تاریخ دانِ عصر و سوانح نگار بھی
علامۂ زمان و ادیبِ شکر مقال

ہر فن مین اُن کا جوہر کامل تھا آشکار
تاریخ و سیرت و ادب و سنت و رجال

اللہ رے اُن کے خامۂ رنگین کا معجزہ
ہر شعبۂ علوم مین دکھلا دیا کمال

کس دل مین کارنامون کی انکے نہین ہے یاد
کس سر مین اُن کے علم و عمل کا نہین خیال

آئی پسند خدمتِ دار المصنفین
اُن کو اسیر کر نہ سکی زلفِ جاہ و مال

اب صوبۂ بہار سے رخصت ہوئی بہار
اٹھین گے اس کی خاک سے ایسے نہ با کمال

تکمیل کو پہنچ نہ سکی سیرۃ النبیؐ
اس غم سے شائقینِ ادب کیون ہون نڈھال

ذات اُن کی آہ ہو گئی واصل بذاتِ حق
قطرہ کا یعنی ہو گیا دریا سے اتصال

اُن کے بغیر دل کو کسی کے نہیں قرار
فرقت میں ہین اعزہ و احباب خستہ حال

اس حادثہ سے پڑ گئے سب کے دلون مین زخم
ایسی جراحتون کا ہے دشوار اندمال

رحمت کے پھول اُن کی لحد پر کھلے رہین
ہو اُن کی خاک مرجعِ انوارِ ذوالجلال

تھا غرقِ بحرِ فکر ولیؔ خانہ خراب
بہرِ تلاشِ مادۂ سالِ ارتحال

ہاتف نے میرے گوشِ حزین میں یہ دی صدا
لکھ از سرِ بکا "غمِ فاضل" بصد ملال

۱۹۵۱ ۲
۲

۱۹۵۳ء

قطعۂ تاریخ اور تاریخی مادے

از

از جناب قاضی فتح محمد صاحب بی۔اے منشی فاضل میانوالی پنجاب

یادِ سید سلیمان ندوی مصنفِ سیرۃ النبی
۱۳۷۳ھ

گیا در تربتِ سید سلیمان ندوی
۱۳۷۳ھ

صدق مقال سید سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہٗ
۱۳۷۳ھ

علامۂ روزگار شریعت پناہ سید سلیمان ندوی
۱۳۷۳ھ ۵۸۰

۱۹۵۳ء

(۲)

شور و شین بہ پاست زیرِ بامِ گردون برگران
بر وفاتِ سید والا نژاد و قدردان

شبلیؔ نعمانی را بود ست آن قائم مقام
نامور سیرت نگار بادشاہِ انس و جان

آفتابِ علم پنہان شد ز اوجِ کائنات
خون ببارد تا ابد زیباست چشمِ آسمان

عالمِ بے مثل رخصت شد ز بزمِ دینیات
عالمانِ دین بماندہ اسف خوان گریہ کنان

سنگ آمد سخت تر بر ملتِ بیضا ہنوز
بر زبانِ خلق جاری الحفیظ والامان

از تجلائے بدل دو گونہ فاتح گفت سال
سیدندوی سلیمان ظلِ حق شکر دہان

۱۳۷۳ھ ۵۸۰

قضاے ناگہان سید سلیمان ندوی ۱۹۵۳ء

۱۳۷۳ھ

فسوسا دریغا ز آسیبِ دوران (۳) روان شد ز ما آہ سید سلیمان

سلیمان کہ بے مثل بودہ سخندان
فقیہ عارف و محرمِ سرِ عرفان

سلیمان کہ بودست سیرت نگارے
سلیمان کہ بُد عاشقِ شاہِ خوبان

سلیمان کہ دانست اسرارِ گیتی
سلیمان کہ گفتہ غوامض ز قرآن

سلیمان خطیب و بلیغ و محقق
سلیمان فصیح خوش بیان مثلِ سحبان

سلیمان کہ بلقیسِ او دین و ملت
سلیمان کہ بُد آصفش نقدِ ایمان

فسوسا ز ما رفت آن رہنمونے
کہ از مرگِ او خلق گشتہ پریشان

بپوشید از خاکدان روے روشن
نہان گشت افسوس آن شمعِ ایقان

بجا شور و شیون است تا اوجِ گردون
زن و مرد و جن و ملک اشک ریزان

خدایا ببخش آن کرم گسترے را
کہ گشت است از چشمِ آفاق پنہان

بہ خلدِ بریں شاد و مسرور باشد
تہِ دامنِ شفقتِ ماہِ خوبان

پئے سالِ مرگش چو اندیشہ کردم
دلم غمزدہ بود و طبعم پریشان

بگوشم ندا آمد از غیب فاتح
سرِ نسخہ غم نیک باطن سلیمان

۱۹۵۳ء

مطبوعات جدیدہ

نقشِ حیات از جناب مولانا حسین احمد صاحب مدنی تقطیع بڑی ضخامت ۷۰۰ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ۔۔۔ غیر مجلد ۔۔۔ ۔ پتہ: (۱) مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی نمبر (۲) الجمعیۃ بک ڈپو قاسم جان اسٹریٹ دہلی (۳) کتب خانہ فخریہ امروہہ گیٹ مرادآباد (۴) محمد اسعد مکان مولانا حسین احمد صاحب دیوبند سہارنپور،

نقشِ حیات حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی خود نوشت سوانح حیات ہے، حضرت مؤلف جلیل القدر عالم دین بھی ہیں، راہ سلوک کے شیخ کامل بھی اور ملک وملت کے مجاہد جانباز بھی، اور ان میں سے ہر ایک راہ میں ان کے کارنامے بڑے عظیم الشان ہیں، اور ان کے فیض کا دائرہ بہت وسیع ہے، مگر ان تمام اوصاف میں جہاد کا رنگ غالب رہا ہے، اور ان کی زندگی کا بڑا حصہ ملکی وملی جہاد میں گذرا، اس لئے ان کی سوانح عمری بھی زیادہ تر اسی کی سرگذشت پر مشتمل ہے، کتاب کے ابتدائی حصہ میں مصنف کے خاندانی تعلیم وتدریس، ہجرت مدینہ وہان کی زندگی، حجاز سے واپسی اور دارالعلوم دیوبند سے متعلق حضرت مولانا گنگوہیؒ سے بیعت اور اس کے فیوض وبرکات کے حالات ہیں، اس کے بعد کتاب کے بڑے حصہ میں انگریزوں کی مخالفت کے اسباب بیان کئے ہیں، اور اس سلسلہ میں ہندوستان خصوصاً مسلمانوں پر انگریزوں کے مظالم اور اُن کے ہاتھوں ان دونوں کی تباہی کی داستان بڑی تفصیل کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ اس بحث پر پہلا حصہ ختم ہو گیا ہے، دوسرے حصہ میں اس کے نتائج یعنی انگریزوں کے خلاف عملی جد وجہد اور ہندوستان کی جنگ آزادی میں شرکت کی تفصیل ہوگی حضرت مولانا کے کارنامے گوناگون ہیں، مگر اس کتاب سے اُن کی زندگی کا صرف ایک رُخ سامنے

آتا ہے، اور اُن کے علمی، دینی اور روحانی فیوض و برکات کا اندازہ نہین ہوتا، ممکن ہے دوسرے حصہ مین اس کا تذکرہ ہو، اور اگر مولانا اپنے قلم سے اس کو لکھنا پسند نہ فرمائین، تو یہ اُن کے متوسلین کا فرض ہو کہ وہ کتاب کے ضمیمہ مین مولانا کے مذہبی و روحانی فیوض پر بھی روشنی ڈالین کہ درحقیقت مولانا کے اصلی کمالات یہی ہین، اور اس سے عام مسلمانون کو بھی فائدہ پہنچے گا، تاہم اُن کی سیاسی سرگذشت سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ برادرانِ وطن نے ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ سے مسلمانون کو بالکل خارج کر دیا ہے، اس کا پورا جواب ہوجائیگا .... اور یہ معلوم ہوجائے گا کہ اس راہ کے پہلے رہنما مسلمان ہی تھے، اور انھون نے اس زمانہ مین ہندوستان کی آزادی کے لئے قربانیان کین جب موجودہ مدعیان آزادی نے اس کا خواب بھی نہین دیکھا تھا،

پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو | مؤلفہ جناب سید ہاشمی صاحب فریدآبادی تقطیع بڑی ضخامت ۳۰۱ صفحے کاغذ عمدہ ٹائپ خوبصورت قیمت مجلد ہے پتہ انجمن ترقی اردو پاکستان اردو روڈ کراچی نمبر۱

فاضل مصنف نے جو انجمن ترقی اردو کے پُرانے خادم اور اس کے کامون میں مولوی عبدالحق صاحب کے دستِ راست ہیں انجمن کی پچاس سالہ جوبلی کی یادگار میں اُس کی تاریخ قلمبند کی ہے جس مین اُس کے زمانۂ قیام سے لے کر اس وقت تک اُس کی پوری سرگذشت تحریر کی گئی ہے، انجمن ترقی اردو نے مختلف حیثیتون سے اردو زبان و ادب کی جو خدمات انجام دی ہین، اُن سے ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہو، اُس نے اُردو مین سنجیدہ علمی و ادبی تصانیف و تراجم اُس کی نادر کتابون کا بڑا ذخیرہ اور اردو زبان کی تاریخ پر بڑا قیمتی مواد فراہم کر دیا ہو، اور علمی و لسانی حیثیت سے اس کی ترقی اور اس کو علمی زبان بنانے مین بڑا کام کیا ہے، اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہو کہ اُس نے ہندوستان مین ہر اردو دشمن محاذ پر پوری قوت سے اسکے مخالفین کا مقابلہ کیا، اور ہر میدان مین اردو کا حق دلانے کی جد و جہد کی اور ملک کے ہر حصہ مین اردو کے تحفظ اور اُس کی توسیع و ترقی کے ذرائع اختیار کئے، اور ان علاقون مین بھی اردو کا مذاق پیدا کر دیا جہان اسکا رواج بہت کم تھا، اگر انجمن

کی کوششین نہ ہوتین تو ہندوستان مین بہت پہلے اردو ختم ہوگئی ہوتی، اور اب وہ پاکستان مین یہ سارے کام انجام دے رہی ہے، اس کتاب مین اس کی پوری روداد اور اس کے کارنامون کی پوری تفصیل ہو، اور آخر مین آیندہ پیشِ نظر کامون کا نقشہ دیدیا ہے، فاضل مؤلف کہنہ مشق اہل قلم ہین، اس لئے انھون نے اس خشک سرگذشت کو اپنے اندازِ تحریر سے بہت دلچسپ بنا دیا ہو،

تلخیص الاردو مرتبہ جناب سید ہاشمی فریدآبادی تقطیع بڑی ضخامت ۱۸۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ:- اردو روڈ کراچی نمبر۱،

یہ کتاب بھی ہاشمی صاحب نے انجمن کی جوبلی کی یادگار مین مرتب کی ہے، اس مین انجمن کے رسالۂ اردو کے تیس سال شائع شدہ اہم مضامین کا انتخاب ہو، اس مجموعہ مین حسب ذیل مضامین ہین، اصول وضع اصطلاحات مولوی وحید الدین سلیم مرحوم، ہجو سلطان محمود پروفیسر شیرانی مرحوم، کلام سلطان قلی قطب شاہ، اردو مین دخیل الفاظ، ولی کے سنہ وفات کی تحقیق، پرانی اردو مین کتبے، مولوی عبدالحق صاحب بنگالی ادب کا نشو و نما (ترجمہ) دنیش چندر سین، عماد الملک بلگرامی مولوی عبدالحلیم شرر، ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی، مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم، بنگالی، اور اردو پروفیسر محمد اجمل خان رومی نطشے، اور اقبال، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب یہ تمام مضامین اپنے معلومات کے لحاظ سے اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہین،

مسلمان بچون کی مذہبی تعلیم کا ابتدائی نصاب | (پانچ حصے) مرتبہ جمعیۃ العلماء ہند دہلی، ضخامت بالترتیب ۴۰، ۹۶، ۱۱۲، ۳۲۰، اور ۳۶۸ صفحات کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجموعی للعہ، پتہ: انجمن بک ڈپو، گلی قاسم جان دہلی،

انڈین یونین، سیکولر حکومت ہو، اس لئے وہ کسی فرقہ کی مذہبی تعلیم کا انتظام نہین کر سکتی، مگر پرائمری اسکولون مین جو نصاب رائج ہے، وہ تمام تر ہندو مذہب اور اس کی روایات پر مشتمل ہے جس کو مسلمانون کی تہذیب و روایات سے کوئی علاقہ نہین، اور اب ابتدائی تعلیم جبری ہوگئی ہے، اور مسلمان بچے

بھی ان اسکولون مین پڑھنے پر مجبور ہین اور سیاسی و معاشی نقطۂ نظر سے بھی سرکاری تعلیم گاہون مین ان کیلئے تعلیم کا انتظام کرنا ضروری ہے، اگر انکی تعلیم محض ان اسکولون تک محدود رہی اور ان کی مذہبی تعلیم کا الگ انتظام نہ کیا گیا، تو وہ اپنے مذہب اور اپنی روایات سے بالکل بیگانہ ہو جائینگے، اس مقصد کے پیش نظر مختلف جماعتون اور ادارون نے مسلمان بچون کی ابتدائی مذہبی تعلیم کے نصاب مرتب کئے ہین، مذکورۂ بالا نصاب جمعیۃ العلماء نے مرتب کرایا ہے، عام طور سے اس قسم کے جو نصاب تیار کئے جاتے ہین، وہ محض عقائد اور روزہ نماز اور حج و زکوٰۃ کے مسائل تک محدود ہوتے ہین، اور ان سے مذہبی تعلیم کا پورا مقصد حاصل نہین ہوتا، مگر جمعیۃ کا نصاب عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق، اسلام کی ابتدائی تاریخ اور سیرت نبوی جملہ دینی پہلوؤن پر حاوی ہے، اور اس مین اردو کی مکمل تعلیم کا بھی پورا لحاظ رکھا گیا ہے، اس لئے وہ ہر حیثیت سے بہت جامع ہے، نصاب کے ساتھ اس کے طریقۂ تعلیم کا ایک ہدایت نامہ بھی ہے، یہ نصاب اس لائق ہے کہ اس کو اسلامی مکاتب مین داخل کیا جائے، اور جہان مکاتب نہ ہون وہان بچون کو پرائیوٹ طریقہ سے پڑھایا جائے،

معلم الانشاء حصۂ اول - مرتبہ مولوی عبد الماجد صاحب ندوی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۸۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ، پتہ منیجر مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ،

لائق مؤلف نے جن کو عربی زبان و ادب کی تعلیم کا عملی تجربہ ہے، اسکی انشاء اور ترجمہ کی تعلیم و مشق کا پورا نصاب مرتب کیا ہے، اس مین ان دونوں کی تدریجی مشقین دی گئی ہین، اور ہر مشق کے ساتھ اسکے متعلق صرف و نحو کے ضروری قواعد بھی لکھ دیے ہین، مشقون مین روزانہ کی ضروریات زندگی کے الفاظ اور فقرون کے استعمال کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے، اور کلام مجید و احادیث نبوی کے فقرے بھی بکثرت دیے گئے ہین، جن سے انشاء کی تعلیم کے ساتھ طلبہ مین مذہبی احساس بھی پیدا ہوتا ہے، اس لیے یہ کتاب تعلیمی اور مذہبی دونون حیثیتون سے مفید ہے، "م"

جلد ۷۳ ماہ جمادی الثانی سنہ ۱۳۷۳ھ مطابق ماہ فروری سنہ ۱۹۵۴ء عدد ۲

مضامین

مقالات

آثار علمیہ و ادبیہ

ادبیات